احمد یار خان

جب پیار نے کروٹ بدلی

جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں

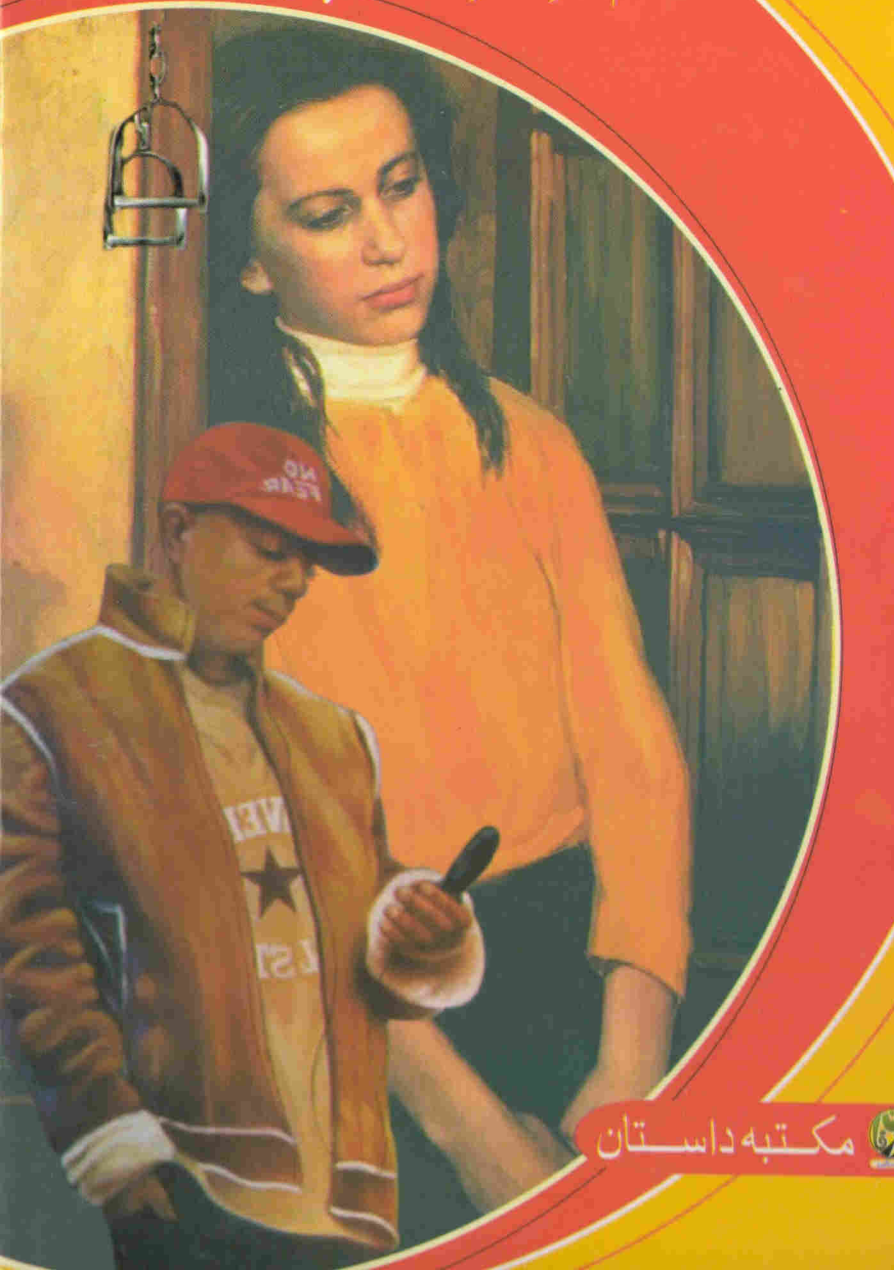

مکتبہ داستان

جب پیار نے کروٹ بدلی

جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں

احمد یار خان

واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

ایک پستول تین پگلے

تھانہ دیہاتی علاقے کا تھا۔ ضلع تو ہندوؤں کی اکثریت کا تھا لیکن میرے تھانے کے علاقے میں مسلمانوں کی آبادی اتنی زیادہ تھی کہ اسے مسلمانوں کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی لڑاکا قوم آباد تھی۔ لڑائی مارکٹائی اور قتل ان کا شغل تھا۔ معمولی سی بات پر ان کی غیرت کی رگ پھڑک اُٹھتی تھی۔ خاندانوں کے درمیان ایک صدی پرانی عداوتیں بھی چلی آرہی تھیں۔ میرے ساتھ والے دو تھانوں کے دیہات میں بھی یہی جنگجو مسلمان آباد تھے۔ تھانیداروں کے لئے مشرقی پنجاب میں دوآبے کا علاقہ جہاں سکھ آباد تھے خطرناک اور تکلیف دہ تھا یا مسلمانوں کا یہ علاقہ جو دوآبے سے دُور تھا۔

خون خرابے اور قتل کی وارداتوں کے پرچے کٹتے ہی رہتے تھے اور تھانے کا عملہ ہر وقت تفتیش میں مصروف رہتا تھا۔ ایک روز تھانے والے گاؤں سے تین میل دُور ویران علاقے میں ایک لاش پائی گئی۔ ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ لاش کس کی ہے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ کوئی نوجوان لڑکا ہے۔ میں اپنے ساتھ عملے کے تین چار آدمی لے کر چل پڑا۔ تھانے سے نکل کر زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے تین آدمی دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک بوڑھا تھا اور ایک جوان اور ان کے ساتھ جو تیسرا آدمی تھا وہ اُن کے گاؤں کا نمبردار تھا۔

ان کے لئے میں رُک گیا۔ بوڑھا مرے ہوتے نوجوان کا باپ تھا۔ جوان آدمی اُس کا بھائی تھا۔ نمبردار انہیں ساتھ لایا تھا۔ ان کا گاؤں اُس جگہ سے جہاں لڑکے کی لاش پڑی تھی، ڈیڑھ پونے دو میل دُور تھا۔ کسی نے لڑکے کو پہچان لیا تھا اور اُس نے ان کے گاؤں جا کر اطلاع دے دی تھی۔ یہ تینوں

وہاں گئے۔ لاش دیکھی اور یکّے کر تھانے میں آتے۔ مجھے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی اس لئے میں روانہ ہو چکا تھا۔

اُنہوں نے مجھے بتایا کہ ایسے لگتا ہے جیسے لڑکے کو گولی ماری گئی ہے۔ باپ کے مُنہ سے تو بات ہی نہیں نکلتی تھی وہ بات کرنے لگتا تھا تو اُس کے مُنہ سے دھاڑیں نکل جاتی تھیں۔ لڑکے کا بھائی اپنے آپ پر قابو پا کر کچھ بتاتا تھا۔ یہ قتل کا کیس تھا۔ مقتول کی عمر سترہ سال بتائی گئی۔ وہ تین بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔

میں گھوڑی پر سوار تھا۔ وہ یکّے میں آتے تھے جسے اُنہوں نے تھانے کے سامنے چھوڑ دیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ یکّے میں موقعہ پر پہنچیں۔ وہ لباس، چہروں اور چال ڈھال سے خوشحال زمیندار اور بڑی ذات کے لگتے تھے۔ لڑائی جھگڑے اور قتل انہی کے درمیان ہوتے تھے جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر غیرت مند تھے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس روپیہ پیسہ تھا جو مقدمہ بازی پر خرچ کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کا سر نیچا رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ یہی اُن کی "شان" تھی۔ ہندو آپس میں نہیں لڑتے تھے حالانکہ ملک کی تجارت اُن کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے سارے ملک کی دولت اُن کے گھروں اور بنکوں میں تھی۔ ہندو جتنا دولت مند ہوتا تھا وہ اتنا ہی سر نیچا رکھتا تھا۔

میں موقعہ پر پہنچا۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو وہاں جمع ہو چکا تھا۔ میں نے یہ اُمید دل سے نکال دی کہ مجھے کوئی کھُرا مل جائے گا۔ ان لوگوں نے میرا بہت نقصان کر دیا تھا۔ میرے کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبل نے آگے جا کر لوگوں کو وہاں سے بھگایا۔ لاش پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ مقتول کی ماں اور بہنیں لاش سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ وہ تو لاش پر لیٹ لیٹ جاتی تھیں زمین پر دوہتڑ مارتیں اور مٹی اُٹھا اُٹھا کر اپنے سروں پر پھینکتی تھیں۔ میں انہیں ڈانٹ یا گھسیٹ کر وہاں سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ میں بھی آخر انسان

تھا۔ اُس وقت میں چھوٹے چھوٹے دو بچوں کا باپ تھا۔ میں ان عورتوں کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی ہی مشکل سے آنسو روک سکا تھا۔

مقتول کے باپ، بھائیوں اور ایک دو اور آدمیوں نے ان عورتوں کو ایک طرف کیا تب میں نے کہا کہ انہیں اتنی دور لے جائیں جہاں سے یہ لاش کو نہ دیکھ سکیں۔

میں نے لاش سے چادر ہٹائی۔ خون میں نہائی ہوئی لاش تھی۔ بائیں کندھے پر چوڑا زخم تھا۔ زیادہ خون وہاں سے نکلا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ زخم کس ہتھیار کا ہے۔ یہ کسی تیز دھار آلے کا یعنی کلہاڑی، تلوار، گنڈاسے یا چاقو کا زخم نہیں تھا۔ وہاں سے تو کندھا پھاڑا گیا تھا۔

جسم کو ہر جگہ سے دیکھا۔ پیٹ میں ناف کے نیچے اور ڈیڑھ دو انچ دائیں ایک سوراخ تھا جو پنسل کی گولائی جتنا یا اس سے بال برابر بڑا ہو گا۔ اس میں سے بھی خون نکل نکل کر جم گیا تھا۔ یہ گولی کا زخم تھا۔ گولی ۳۰۳ رائفل کی ہو سکتی تھی یا ریوالور کی۔ میں گولی کے زخم سے واقف تھا۔ گولی جسم میں جہاں سے داخل ہوتی ہے وہاں چھوٹا سا سوراخ کرتی ہے اور جہاں سے باہر نکلتی ہے وہاں خاصا بڑا زخم کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گولی لٹو کی طرح گھومتی ہوئی آتی ہے۔

اگر مقتول کو گولی ماری گئی تھی تو یہ ناف کے نیچے سے داخل ہوتی اور بائیں طرف کے کندھے سے نکلی تھی۔ اس سے یہ بات بنتی تھی کہ گولی نیچے سے ماری گئی یا مقتول لیٹا ہوا تھا تو اُسے گولی اُس طرف سے ماری گئی جس طرف اُس کے پاؤں تھے، یا مقتول کسی ریوالور والے کے ساتھ گتھم گتھا ہوا اور اُسے گرا لیا۔ اگر گرا لیا تھا تو وہ پیٹھ کے بل گرا ہو گا۔ مقتول اُس کے پیٹ پر بیٹھ گیا اور قاتل نے ریوالور نیچے سے فائر کیا۔ گولی ناف کے دائیں طرف سے داخل ہوئی اور پیٹ میں سے ترچھی گزرتی ہوئی کندھے کی ہڈی توڑ کر نکل گئی ـــ لیکن کیا یہ گولی ہی تھی؟

اس سوال کا جواب پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے دینا تھا۔

لاش کے لئے چارپائی آچکی تھی۔ میں نے لاش کے اِرد گرد زمین دیکھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑائی کے گتھم گتھا ہونے اور گرنے کے نشان ہیں یا نہیں۔ وہاں تو اب "نہیں" کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لوگوں نے زمین کی شہادت کو پاؤں سے مَسل ڈالا تھا۔

جہاں لاش پڑی تھی وہ جگہ راستے سے بیس بائیس قدم ہٹ کر تھی۔ یہ راستہ بڑی پگڈنڈی نہیں تھی۔ چھوٹا سا راستہ تھا۔ اردگرد زمین کچھ کٹی پھٹی تھی۔ کانٹوں والی جھاڑیاں تھیں اور سرکنڈے تھے جو قدرتی طور پر اُگے ہُوتے تھے۔ کھیت کچھ دُور سے شروع ہوتے تھے۔ اس جگہ سے تھوڑی ہی دُور ایک گاؤں تھا۔ فاصلہ ایک میل سے کم ہوگا۔

میرا ہیڈ کانسٹیبل عقل والا آدمی تھا اور اپنے فرائض کو سمجھتا تھا۔ میں لاش کا نظری معائنہ کرنے اور پھر زمین کو دیکھنے میں مصروف تھا اور ہیڈ کانسٹیبل لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ وہ دو لڑکوں کو میرے پاس لے آیا۔ اُن کی عمریں چودہ پندرہ سال تھیں۔ وہ قریب والے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ دونوں موقعۂ واردات سے کچھ دُور پانی کے جوہڑ کے کنارے بیٹھے ہوتے تھے۔ اُن کی بھینسیں پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُنہوں نے گولی چلنے کی آواز سُنی تھی۔ وہ سمجھے کہ کسی شکاری نے کارتوس فائر کیا ہے۔ انہوں نے اُٹھ کے دیکھا۔ انہیں دو آدمی جاتے واردات کی طرف سے راستے پر چڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ سرکنڈوں کی وجہ سے ان آدمیوں کے سَر، کندھے اور پیٹھوں کا کچھ حصہ دکھائی دیا تھا۔ بہت آگے گئے تو وہ سَر سے پاؤں تک نظر آتے تھے۔ اُن کے پاس بندوق نہیں تھی۔

میرے پوچھنے پر لڑکوں نے بتایا کہ وہاں سے لاش نظر نہیں آسکتی تھی۔ انہیں ایسا شک نہیں ہُوا تھا کہ وہ دو آدمی کسی کو گولی مار کر جا رہے ہیں۔ لڑکوں نے ان آدمیوں کے لباس بتاتے۔ انہوں نے چہرے اچھی

طرح نہیں دیکھے تھے۔

میں نے تماشائیوں کو جو وہاں موجود تھے اکٹھا کرکے پوچھا کہ کسی نے ان دو آدمیوں کو ادھر آتے دیکھا ہوگا۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

لاش کی برآمدگی کی کاغذی کارروائی کرکے لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوادی اور میں مقتول کے گاؤں چلا گیا۔ وہاں چوپال میں بیٹھنا تھا لیکن مجھے ایک بڑے مکان کی بیٹھک میں بٹھایا گیا۔

دروازہ کھلا رکھنا!

میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن وقتوں میں رائفلیں اور ریوالور آج کی طرح عام نہیں تھے۔ لوگ لاٹھیوں، کلہاڑیوں، گنڈاسوں، چھُریوں اور خنجروں سے ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے یا کسی قتل میں شکاری بندوق استعمال ہوجاتی تھی۔ ریوالور کسی ریٹائرڈ فوجی افسر کے پاس ہوتا تھا جس کا باقاعدہ لائسنس ہوتا تھا۔ یہ افسر اکثر صوبیدار میجر، صوبیدار اور جمعدار ہوتے تھے۔ آج کل جمعدار کو نائب صوبیدار کہتے ہیں۔ ان میں سے جن کے پاس ریوالور ہوتا تھا اسے وہ زیور کی طرح اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ گولیوں والی بیلٹ کندھے سے لٹکائی ہوتی اور اس کے ساتھ ریوالور ہوتا تھا۔ یہ محض نمائش تھی۔ ان لوگوں نے کبھی شوقیہ بھی گولی نہیں چلائی تھی۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ریوالور سے قتل کرنا اُن دنوں کے رواج کے خلاف تھا۔ البتہ کسی بڑے پیمانے کے ڈاکو یا رہزن کے پاس ریوالور ہوتا ہوگا۔ آج تو کلاشنکوف جیسی گن بھی عام سی چیز بن گئی ہے اور ریوالور شادیوں پر چلتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ان میں سے کتنے ریوالور لائسنس والے اور کتنے بلا لائسنس ہیں۔

سوچنے والی بات یہ تھی کہ مقتول کو اگر کسی ڈاکو یا رہزن نے گولی ماری ہے تو نیت لُوٹنے کی ہوگی لیکن رہزن کسی کو قتل نہیں کیا کرتے تھے۔

ڈرا کر لوٹ لیتے اور اپنے شکار کو چلتا کرتے تھے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ واردات دن کے وقت ہوئی تھی۔ گو وہ علاقہ ویران تھا لیکن ایسا سنسان اور اُجاڑ بھی نہیں تھا کہ رہزن کسی کو روک لیتے۔ قریب سے راستہ گزرتا تھا۔ یہ دشمنی والا قتل ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلایا۔ مقتول کے متعلق بتا دوں کہ وہ سترہ سال عمر کا تھا اور خوبصورت تھا۔ خوبصورتی سے مراد آج کل کے نوجوانوں کی خوبصورتی نہیں۔ میں اُس وقت کی خوبصورتی کی بات کر رہا ہوں۔ مقتول کا رنگ صاف تھا۔ چہرے کے نقش دلکش تھے۔ قد چھ فٹ نہ ہُوا تو ایک آدھ انچ کم ہو گا اور جسم کے پٹھے بنے ہوتے تھے، یعنی جسم طاقتور تھا۔ اُس کی لاش دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہُوا کہ کتنا اچھا جوان ضائع ہو گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اُسے شیرا کہتے تھے۔ پورا نام شیر انگن تھا۔

"کسی کے ساتھ دشمنی؟" — میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا۔

"خاندانی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں" — باپ نے جواب دیا — "ہم نے کبھی کسی آدمی کا نقصان نہیں کیا تھا۔"

"آپ کے بیٹے کی کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی ہو گی!" — میں نے کہا — "جس پر آپ کو ذرا سا بھی شک ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"ذرا سا شک تو کسی پر بھی نہیں" — اُس نے کہا — "ایک آدمی پر پکا شک ہے .... وہ فوج میں جمعدار (نائب صوبیدار) ہے۔ نیا نیا جمعدار بنا ہے اور ڈیڑھ مہینے کی چھٹی آیا ہُوا ہے۔ اُس کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔ سات آٹھ مہینے گزرے اُس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔ یہ کنواری لڑکی تھی۔ شیرا اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن جمعدار نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔"

"کیا آپ اپنے بیٹے کے لئے اس لڑکی کا رشتہ نہیں لے سکتے تھے؟"

"لے سکتے تھے" — باپ نے جواب دیا — "لیکن شیرے کی ماں کو

ایک اور لڑکی پسند تھی۔ شیرے نے اُس لڑکی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر ہم نے اِس سے زیادہ خوبصورت لڑکی اپنے بیٹے کو دکھائی تھی لیکن اُس نے اس لڑکی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ اس لڑکی کو چاہتا تھا جو بعد میں جمعدار کی بیوی بن گئی۔"

"کیا یہ لڑکی بھی آپ کے بیٹے کو چاہتی تھی؟"

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا — "ان کی تو وہی محبت تھی جو آپ قصے کہانیوں میں پڑھا کرتے ہیں۔"

"پھر وہ لڑکی جمعدار کے ساتھ خوش تو نہیں ہو گی!" — میں نے کہا۔

"ویسے تو جمعدار کوئی ایسا بوڑھا تو نہیں ہو گیا" — مقتول کے باپ نے جواب دیا — "اُس کی عمر ابھی پینتیس سال بھی نہیں ہوئی لیکن یہ شادی لڑکی کی پسند کے خلاف ہوئی ہے اس لئے لڑکی خوش نہیں۔ سُنا ہے روتی رہتی ہے۔"

"تم مجھے بتا رہے تھے کہ تمہیں جمعدار پر شک ہے" — میں نے کہا — "وہ شک بتاؤ۔"

"شادی کے بعد بھی یہ لڑکی اور میرا بیٹا آپس میں ملتے رہے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر آتی تھی تو میرا بیٹا وہاں چلا جاتا تھا" — وہ کچھ سوچنے لگا، پھر بولا — "جمعدار شادی کر کے لڑکی کو اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ پہلی بیوی سے اُس کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا ہے جس کی عمر نو دس سال ہے اور دوسری بچی ہے جس کی عمر چھ سات سال ہے۔ لڑکا یہاں سکول میں داخل ہے، شاید اس لئے جمعدار اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ نہیں لے گیا۔ ہو سکتا ہے اُسے سرکاری کوارٹر نہ ملا ہو۔ مجھے پتہ چلا کہ میرا بیٹا رات کو جب سب سوتے ہوتے تھے، جمعدار کے گھر چلا جاتا تھا۔ یہ ملاقاتیں جمعدار کی غیر حاضری میں ہوتی تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ لڑکی میرے بیٹے کے لئے دروازہ کھلا رکھتی تھی۔"

"آپ کو کس نے بتایا تھا؟"

"بتایا کسی نے نہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "میں نے ایک رات، آدھی رات کے بعد اپنے بیٹے کو چارپائی سے غائب دیکھا تو میں باہر نکلا۔ وہ اُسی طرف سے آرہا تھا جدھر جمعدار کا گھر ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہیں سے آرہا ہے لیکن میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ وہ ایسے ہی باہر نکل گیا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ اس لڑکی سے ملنا چھوڑ دو، حاصل تو کچھ ہوگا نہیں جمعدار یا اُس کے رشتے داروں کے ساتھ دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ میرے بیٹے نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا کہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ میں سمجھا کہ میرا بیٹا سچ کہہ رہا ہے۔"

"کیا جمعدار نے اپنی بیوی کو اپنے ماں باپ سے الگ رکھا ہوا تھا؟"

"جی ہاں!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "وہ اپنی پہلی بیوی کو بھی الگ رکھتا تھا.... چودہ پندرہ دن ہوئے جمعدار ڈیڑھ مہینے کی چھٹی آگیا۔ اُس کی چھٹی کے چار پانچ دن گزرے تو اُس نے میرے بڑے بیٹے سے کہا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو لگام ڈال کے رکھو ورنہ وہ تمہیں زندہ نہیں ملے گا۔ جمعدار نے ایسے رعب سے بات کی کہ میرا بیٹا برداشت نہ کر سکا۔ میرے بیٹے اور جمعدار کے درمیان زبانی جھگڑا ہو گیا۔ میرے بیٹے نے یہ بھی نہ پوچھا کہ جمعدار کو شیرے کے خلاف کیا شکایت تھی۔ مجھے پتہ چلا تو میں جمعدار سے ملا۔ مَیں اُس کے ساتھ دشمنی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا....

"اُس نے میرے ساتھ بھی بڑے رعب اور غصے سے بات کی۔ میں نے اُس کا غصہ برداشت کیا اور اُس سے پوچھا کہ میرے بیٹے نے اُس کا کیا نقصان کیا ہے۔ تب اُس نے بتایا کہ شیرا اُس کی بیوی سے چوری چھپے ملتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ میرا بیٹا اگر اُس کی بیوی سے ملتا ملاتا ہے تو اس میں اُس کی بیوی کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ میری اس بات پر وہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے مجھے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تمہیں اپنے بیٹے کی ضرورت ہے تو اُسے سنبھال کر رکھو ورنہ اُس کی

لاش اُٹھا کر لاؤ گے....

"پھر جناب! میں نے غصے کا جواب اُس سے زیادہ غصے سے دیا اور اُسے کہا کہ میرے بیٹے کی طرف تم نے آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو تمہاری آنکھیں نکال لوں گا.... ہم دونوں کے درمیان بہت تُو تُو مَیں مَیں ہوتی۔ کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اُدھر سے میرے تینوں بیٹے آگئے، اِدھر سے جمعدار کے رشتے دار نکل آئے۔ گاؤں کے پنچوں نے درمیان میں آکر لڑائی جھگڑا نہ ہونے دیا ورنہ بہت خون خرابہ ہو جاتا۔ مَیں نے آپ کو یہ بات تھوڑی بتائی ہے۔ بڑی زیادہ بَک بَک جھک جھک ہوتی تھی۔ اس کے بعد جمعدار کے ساتھ ہماری بول چال بند ہو گئی تھی۔"

"شیرا جا کہاں رہا تھا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں" ـــ باپ نے جواب دیا ـــ "گھر سے کسی نے بھی اُسے کسی کام سے نہیں بھیجا تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اُسے موت وہاں لے گئی تھی۔"

جوانی کا خون

"کیا تم نے شیرے سے پوچھا تھا کہ وہ جمعدار کی بیوی سے ملتا ہے؟"

"نہیں" ـــ باپ نے جواب دیا ـــ "اگر وہ ملتا بھی تھا تو ہم نے پرواہ نہ کی۔ جمعدار نے ہمیں بہت بُری دھمکیاں دی تھیں۔ اگر میں اپنے بیٹے سے باز پُرس کرتا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ میں اور میرے بیٹے جمعدار سے ڈر گئے ہیں۔"

"کیا جمعدار کے پاس پستول ہے؟"

"ہاں جی!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "اُس کے پاس چھ گولیوں والا پستول ہے۔"

"ل.. میں کبھی شیرے کے ساتھ جمعدار کا آمنا سامنا تو نہیں ہوا؟"

"اگر ہوتا تو شیرا مجھے ضرور بتاتا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔"مَیں نے اپنے تینوں بیٹوں کو کہہ دیا تھا کہ جمعدار کبھی اُونچی بات بھی کرے تو اُس کی ہڈیاں توڑ دو۔ آپ میری اس بات کو اچھا نہیں سمجھیں گے لیکن جناب! میں نے ساری عمر کسی کی دھمکی نہیں سُنی تھی۔"

"اتنی اکڑ دکھانے کی بجائے اپنے بیٹے کو باز کرتے تو آج تمہیں یہ صدمہ نہ ہوتا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"کون برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کی بیوی سے کوئی چوری چُھپے ملے؟"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے بیٹے کا قاتل جمعدار ہے؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔"قاتل اور کوئی بھی ہو سکتا ہے.... اپنے بیٹے کے قاتل دراصل تم خود ہو۔ تم اپنے بیٹے کو بُرے کاموں میں بھی شہ دیتے رہے ہو۔ مجھے شک ہے کہ تمہارا بیٹا جس طرح جمعدار کی بیوی سے ملتا ملاتا رہا ہے اسی طرح اُس نے کسی اور کی بیوی یا بیٹی یا بہن کے ساتھ ایسا ہی تعلق رکھا ہُوا تھا یا رکھنے کی کوشش کی ہو گی اور لڑکی والوں نے اُسے دنیا کے تختے سے ہی اُٹھا دیا۔"

اُس پر خاموشی تو طاری ہو گئی لیکن اُس نے اپنی گردن کی اکڑن کم نہ کی۔ میں وعظ کرنے والا مولوی نہیں تھا کہ اسی مسئلے پر اُسے شرمسار کر کے پند و نصیحت کرتا رہتا۔ میں نے قاتل کا کھوج لگانا تھا۔ میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا کہ مقتول کیسا تھا یعنی اُس کی عادتیں کیسی تھیں۔

"سب سے چھوٹا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔"اس لئے سب اُس سے پیار کرتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔"

مختصر یہ کہ سب نے مِل کر لڑکے کو بگاڑا ہُوا تھا اور وہ خودسَر ہو گیا تھا۔ من مانی کرتا تھا۔ نہ گھر میں کسی سے ڈرتا تھا نہ گاؤں کے کسی چھوٹے یا بڑے کو کچھ سمجھتا۔ میری رائے یہ تھی کہ اُس کی یہی عادتیں اُس کے قتل کا باعث بنیں۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ قاتل کون ہے۔ میرا شک جمعدار پر مرکوز ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ لوگ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ جمعدار بھی اسی قوم کا آدمی تھا اور وہ زیادہ خطرناک اس وجہ سے بھی ہو گیا تھا کہ وہ آدمی فوجی تھا اور جمعدار ہو گیا تھا۔ اُس زمانے میں کسی کسی فوجی کو جمعداری کا عہدہ ملتا تھا تو اُس کی گردن اکڑ کر ذرا ٹیڑھی ہو جایا کرتی تھی اور جمعدار جب پہلی چھٹی گاؤں آتا تھا تو سارے گاؤں کی آبادی کو اپنی پلٹن سمجھ کر ہر کسی کے ساتھ رُعب سے بات کرتا تھا۔

یہ جمعدار بھی نیا نیا عہدہ لے کر چھُٹی آیا تھا۔ وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتا کہ اُس کی بیوی سے کوئی ملتا، پھر مقتول کے باپ اور بھائیوں نے اُس کا رُعب نہیں مانا بلکہ اُلٹا اُس پر رُعب ڈالا تھا۔ میں نے مقتول کے باپ کو باہر بھیج کر نمبردار کو بُلایا اور اُس سے مقتول، جمعدار اور اُس کی نئی بیوی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے جمعدار کی نئی اور نوجوان بیوی کا نام رابی بتایا۔ پورا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ رابعہ ہو گا۔

"یہ کوئی چھُپی ہوئی بات نہیں"۔۔۔ نمبردار نے مجھے بتایا ۔۔۔"شیرے اور رابی کی محبت کا قصہ سارے گاؤں کو نہیں تو ساری برادری کو تو ضرور ہی معلوم ہے۔ شیرے نے رابی کی خاطر دو بڑے اچھے اور خوبصورت رشتے قبول نہیں کئے تھے۔ رابی کو جمعدار لے گیا تو شیرے نے رابی کا پیچھا نہ چھوڑا اور رابی نے شیرے کو اپنے دل سے نہ نکالا۔ جمعدار رابی کو اپنی پہلی بیوی کے دو بچوں کے پاس چھوڑ گیا تھا۔"

نمبردار نے تقریباً وہی باتیں بتائیں جو مقتول کا باپ بتا چکا تھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مجھے ان کے لڑائی جھگڑے کی بات سُنائے۔ اُس نے پوری بات سُنا دی۔ یہ بھی مَیں مقتول کے باپ سے سُن چکا تھا۔

"وہاں سے پکّی دُشمنی شروع ہو گئی"۔۔۔ نمبردار نے کہا ۔۔۔"مجھے تو یہ نظر آ رہا تھا کہ ان میں لڑائی کسی نہ کسی دن ہو جائے گی اور دونوں طرفوں کے ایک ایک دو دو آدمی مارے جائیں گے۔"

"جمعدار نے کبھی تمہارے ساتھ اس معاملے پر بات کی تھی؟"

"ایک بار نہیں چار پانچ بار!" — نمبردار نے جواب دیا — "یہ لفظ تو اُس نے ہر دفعہ کہے کہ اس لڑکے کی موت میرے ہاتھ پر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے.... میں نے دو تین روز پہلے شیرے کو کہا تھا کہ بیٹا! تم ہی کچھ خیال کرو۔ دیکھو بڑوں میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔ جناب! اس لڑکے نے مجھے بہت بُرا جواب دیا۔ کہنے لگا جمعدار کو کہو کہ رابی کو طلاق دے دے.... پھر جناب، میں نے کچھ نہ کہا۔ سوچا کہ لڑکے میں جوانی کا نیا نیا خون ہے اور لڑکا بدتمیز بھی ہے۔ کہیں مجھے کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ کہہ دے۔"

"جمعدار جب چھٹی نہیں آیا تھا" — میں نے کہا — "یعنی اُس کی غیرحاضری میں شیرا رات کو جمعدار کے گھر جایا کرتا تھا؟"

"میں نے خود تو نہیں دیکھا" — اُس نے جواب دیا — "سُنا ہے جایا کرتا تھا۔"

نمبردار نے اس سے زیادہ جتنی باتیں بتائیں ان سے میرا یہ شک مزید پختہ ہوا کہ قاتل جمعدار ہے۔ نمبردار نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ شیرے نے کبھی کسی اور لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی نہیں کی تھی۔

"ایسے کرو" — میں نے نمبردار سے کہا — "تم جاؤ اور جمعدار کو میرے پاس بھیج دو۔"

"میں دیکھتا ہوں" — نمبردار نے کہا — "وہ کل صبح سے شکار پر گیا ہوا ہے۔ اُس کے پاس دونالی بندوق بھی ہے۔ رات کو بھی نہیں آیا تھا۔ دن کو بھی نظر نہیں آیا۔ دیکھتا ہوں شاید آ گیا ہو۔"

جمعدار سے جرنیل

نمبردار نے آ کر بتایا کہ جمعدار ابھی تک نہیں آیا۔ میں نمبردار کے ساتھ باتیں کر ہی رہا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ جمعدار باہر کھڑا ہے۔ مَیں نے اُسے اندر

بلا لیا۔ اُس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ اُس کا حُلیہ بتا رہا تھا کہ وہ شکار سے ہی آیا ہے۔ میں نے نمبردار کو باہر بھیج دیا اور جمعدار کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

"میں ابھی ابھی شکار سے واپس آیا ہوں" — اُس نے بڑے افسروں جیسے رُعب سے کہا — "گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ آپ کا بلاوا آیا ہے۔ میں سیدھا اِدھر آ گیا" — وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا — "آپ تھوڑی دیر انتظار کریں، میں نہا کر اور کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

اُس کے بولنے کا انداز ویسا ہی تھا جیسے انگریز افسر ہندوستانیوں کے ساتھ بات کیا کرتے تھے۔ یہ تو اُس کے بولنے کا انداز تھا، اُس کی جسمانی پوزیشن یہ تھی کہ سر سے پاؤں تک سیدھا اکڑا ہُوا تھا اور اُس کی گردن کچھ زیادہ ہی اکڑی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف اپنا چہرہ گھما کر بات نہیں کرتا تھا بلکہ آنکھیں گھما کر میری طرف کرتا اور بولتا تھا۔ یہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تم بہت چھوٹے آدمی ہو۔

"جمعدار صاحب!" — میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا — "آپ تشریف رکھیں۔ میں جب آپ کو فارغ کروں گا اُس وقت جا کر نہا لینا۔"

"آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں" — اُس نے جمعدار سے جرنیل بن کر کہا — "میں جمعدار ہوں۔ میں آپ کو بعد میں ٹائم دوں گا۔"

"پھر میں آپ کو تھانے میں ٹائم دوں گا" — میں نے کہا — "آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ خاموشی سے بیٹھ جائیں۔ اگر میں نے آپ کو تھانے بُلا لیا تو پھر میں بتا نہیں سکتا کہ میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔"

اُس نے پھر بھی اپنا رُعب جھاڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی عادت کے مطابق گرج کر اُسے کہا کہ وہ بیٹھ جائے تب وہ آہستہ آہستہ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔

"آپ نے مجھے کیوں بٹھا لیا ہے؟" — اُس نے پوچھا اور کہنے لگا — "آپ کو میری عزت کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

"میں جو پوچھوں وہ سچ سچ بتا دینا"— میں نے کہا —"میں کوئی فالتو بات نہیں کروں گا اور کوئی فالتو سُنوں گا بھی نہیں ..... ایک نوجوان لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے باپ پر شُبہ ہو گا تو میں اُسے بھی شامل تفتیش کر لوں گا۔"

"کیا آپ مجھے مشتبہ سمجھتے ہیں؟"— اُس نے میری پوری بات سُنے بغیر پوچھا۔

"بکومت!"— میں نے فوجی افسروں کے لہجے میں کہا —"پہلے میری بات پوری ہو لینے دو۔"

"میرے ساتھ تمیز سے بات کریں"— اُس نے کہا۔

"بکومت!"— میں نے پہلے سے زیادہ اُونچی اور سخت آواز میں کہا —"زیادہ بک بک مت کرو۔ ورنہ میں حراست میں لے کر تھانے لے جاؤں گا اور وہاں اُس طریقے سے تفتیش کروں گا جو پولیس کا اصل طریقہ ہوتا ہے ..... آپ کے پاس ریوالور ہے؟"

"ہاں، ہے"— اُس نے جواب دیا —"میرے پاس اس کا لائسنس ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"گھر میں رکھا ہے"— اُس نے جواب دیا۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے اس کا ریوالور دیکھا جاتے۔ اس میں سے ضرور ایک گولی فائر ہوئی ہو گی۔ نمبردار نے جب مجھے بتایا تھا کہ جمعدار ایک روز پہلے کا شکار پر گیا ہوا ہے تو مجھے یہ خیال آیا تھا کہ وہ مقتول کو کسی طرح ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہو گا اور اُسے راستے میں گولی مار دی، یا مقتول اُسے نظر آ گیا ہو گا اور اس نے مقتول کو گولی ماری ہو گی۔ مجھے یہ خیال بار بار آتا تھا کہ گولی نیچے سے لگی تھی۔ اب مجھے یہ صورت نظر آنے لگی کہ مقتول کو گولی اُس جگہ سے جہاں اُس کی لاش پڑی ہوئی تھی کہیں دُور سے ماری گئی تھی اور وہ یہاں تک آ گیا اور گر پڑا۔

یہ سوچ مجھے آئی تو سہی لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ مقتول کسی بلند جگہ پر کھڑا تھا اور قاتل نے نیچے کھڑے ہو کر گولی چلائی ..... یہ بعد کی بات تھی۔ میرے کرنے والا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ جمعدار کا ریوالور دیکھوں۔ میں نے جمعدار سے کہا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے چلے اور اپنا ریوالور دکھاتے۔ میں نے نمبردار کو اور دو اور معزز افراد کو ساتھ لے لیا۔

جب ہم اُس کے گھر تک پہنچے تو اُس نے ہمیں باہر ٹھہرنے کو کہا اور یہ کہہ کر اندر جانے لگا کہ میں ریوالور لے کر آتا ہوں۔

"جمعدار صاحب!"— میں نے اُس کا بازو پکڑ کر کہا —"ہم سب اندر جائیں گے اور دیکھیں گے کہ آپ ریوالور کہاں سے نکالتے ہیں۔"

مجھے شک یہ تھا کہ شکاری بندوق کے ساتھ یہ شخص ریوالور بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اب واپس آیا تو یہ ریوالور صاف کر کے اور گھر رکھ کر میرے پاس آیا ہو گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم سب اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں جائیں۔ اِسے وہ خانہ تلاشی سمجھ رہا تھا۔ خانہ تلاشی کو لوگ اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ میں نے، نمبردار اور معززین نے اُسے سمجھایا کہ وہ تفتیش سے بچ نہیں سکتا۔ اُسے سمجھانے کے لئے مجھے تھوڑی سی سخت کلامی کرنی پڑی۔ آخر ہم سب اُس کے ساتھ اندر چلے گئے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ جمعدار نے اپنی بیوی کو لالٹین جلانے کو کہا۔ میں نے اُس کی بیوی کو دیکھا۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور وہ مقتول کی ہم عمر تھی۔ یہ رابی تھی وہ نوجوان لڑکی تھی لیکن اس جمعدار کے ساتھ اُس کا جوڑ بُرا نہیں لگتا تھا۔ یہ کہنا ٹھیک نہیں تھا کہ یہ نوجوان لڑکی ایک بوڑھے کی بیوی بنا دی گئی ہے ..... جمعدار کی عمر تیس سال سے تین چار سال زیادہ ہو گی لیکن وہ تیس سے کم عمر کا لگتا تھا۔ اُس کا رنگ سفیدی مائل تھا۔ چہرے پر جوانی کا خون تھا۔ نقش بہت اچھے تھے۔ قد اور جسم باکسروں جیسا تھا لیکن وہ جب جمعداروں کی طرح اکڑتا اور بناوٹی لہجے میں بات کرتا تھا تو بہت بُرا لگتا تھا۔

اُس کے مردانہ حُسن اور وقار پر فضول سا پردہ پڑ جاتا تھا۔

وہ ہمیں اندر ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ بچھا ہُوا تھا اور ایک دیوار کے ساتھ اوپر نیچے ٹرنک اور سوٹ کیس رکھے ہوتے تھے۔ اُس نے ایک سُوٹ کیس جو دو ٹرنکوں کے اُوپر رکھا ہُوا تھا اُتار کر پلنگ پر رکھا اور اُوپر والے ٹرنک کا تالا کھولا، پھر اُس نے ٹرنک میں رکھے ہُوتے کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں بیلٹ تھی۔ اُس نے بیلٹ کے ساتھ لگے ہوتے پوچ کو دیکھا جس میں ریوالور رہتا ہے۔ پوچ میں ریوالور نہیں تھا۔

جمعدار کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اُس نے پھر ٹرنک میں ہاتھ ڈالا پھر ٹرنک میں سے تمام کپڑے نکال کر باہر پھینک دیئے مگر ریوالور نہ ملا۔

میں نے بیلٹ دیکھی۔ اُس میں اٹھارہ گولیاں اُڑسنے کے لئے چمڑے کے خانے بنے ہوتے تھے۔ ان میں بارہ گولیاں تھیں۔ جمعدار نیچے والے ٹرنک کا تالا کھول رہا تھا۔

"جمعدار صاحب!" — میں نے اُس سے پوچھا — "کیا آپ کے پاس صرف بارہ گولیاں ہیں؟"

"اٹھارہ جناب اٹھارہ!" — اُس نے کہا اور میرے ہاتھ سے بیلٹ لے کر دیکھی۔ کہنے لگا — "چھ گولیاں بھی غائب ہیں"

اُس نے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا۔ اُسے بھی خالی کیا۔ ریوالور اس میں بھی نہیں تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا اور بیوی کو بلا کر پوچھا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کمرے میں بھی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ بیوی نے اُسے کہا کہ اُس نے تو ٹرنک کھولے ہی نہیں۔ وہ غصّے میں آگیا اور ٹرنکوں والے کمرے میں آکر اُس نے سارے ٹرنک اور سُوٹ کیس کھولے۔ ان میں جو کپڑے اور دیگر سامان تھا وہ پلنگ اور کمرے میں بکھر گیا لیکن ریوالور کا کچھ پتہ نہ چلا۔ جمعدار نے دوسرے کمرے میں جا کر اپنی بیوی کو اور بچوں کو بُرا بھلا کہا لیکن اُنہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ریوالور کہاں ہے۔

کیا مَیں بدصورت ہُوں؟

"جناب!" — اُس نے میرے پاس آکر کہا — "ریوالور کا کچھ پتہ نہیں اور میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ ریوالور کہاں گیا۔ چھ گولیاں بھی چلی گئی ہیں۔"

میں نہیں ماننا چاہتا تھا کہ ریوالور گھر میں نہیں ہے۔ مجھے یہ شک ہونا قدرتی بات تھی کہ جمعدار ریوالور میرے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے ریوالور سے ایک گولی فائر کی ہو یا زیادہ گولیاں فائر کی ہوں۔ ریوالور کی نالی کو بڑی اچھی طرح صاف کر کے اسے تیل دینے کی ضرورت تھی۔ میرا شک یہ تھا کہ جمعدار شکار سے آیا تو اُس نے ریوالور کہیں چھپا دیا اور میرے پاس آگیا کیونکہ میں نے اُسے بلایا تھا۔ وہ اتنی جلدی ریوالور کی نالی صاف نہیں کر سکتا تھا۔

ریوالور، رائفل یا کسی ہتھیار سے ایک بھی گولی فائر ہوتی ہو تو اسلحہ کے ماہرین فوراً پہچان لیتے ہیں کہ اس میں سے ایک یا ایک سے زیادہ گولیاں فائر ہوتی ہیں۔

میں نے جمعدار کو بازو سے پکڑا اور ذرا پرے لے جا کر اُسے کہا کہ وہ ریوالور میرے حوالے کر دے۔

"آپ سارے گھر کی تلاشی لے لیں" — اُس نے کہا — "اور میری یہ رپورٹ لکھ لیں کہ میرا ریوالور چوری ہو گیا ہے اور چھ گولیاں بھی۔"

"جمعدار صاحب!" — میں نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "میں فوجی نہیں ہوں، پولیس انسپکٹر ہوں۔ آپ کا بھلا اسی میں ہے کہ آپ ریوالور خود ہی مجھے دے دیں اور جو گولیاں فائر نہیں ہوئیں وہ بھی دے دیں۔"

آخر مجھے اُس کے گھر کی تلاشی لینی پڑی۔ میں نے بڑی باریکی سے تلاشی لی تھی لیکن ریوالور نہ ملا۔ میں نے اُس کی بیوی کو الگ کر کے اُس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ جمعدار گھر آیا تو اُس کے ہاتھ میں صرف بندوق تھی۔

بیوی نے اُسے بتایا کہ نمبردار تھانے کا بلاوا لے کر آیا تھا۔ جمعدار نے بندوق بیوی کو دی اور جو پرندے وغیرہ وہ مار کر لایا تھا وہ بھی بیوی کے حوالے کئے اور میرے پاس آگیا۔

مجھے ایک شک یہ ہُوا کہ جمعدار ریوالور کہیں اور چھوڑ آیا ہے لیکن وہ مجھے یہی بات کہے جا رہا تھا کہ اُس کا ریوالور چوری ہو گیا ہے اور میں رپورٹ لکھ کر تفتیش کروں۔ میں اُسے اپنے ساتھ وہاں لے گیا جہاں بیٹھ کر میں تفتیش کر رہا تھا۔

"اگر ریوالور چوری ہُوا ہے تو آپ کو کس پر شک ہے؟" — میں نے جمعدار سے کہا — "ٹرنک کا تالا ٹوٹا ہُوا نہیں تھا۔ چوری یا ڈکیتی کے کوئی نشان نہیں ہیں۔ پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ریوالور چوری ہو گیا ہے؟"

"یہ مَیں نہیں جانتا" — اُس نے غصّے سے کہا — "یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔"

"اگر ریوالور چوری ہُوا ہی ہے تو چور آپ کے گھر کا کوئی فرد ہو گا" — میں نے کہا اور پوچھا — "کیا میں آپ کی بیوی اور بچوں کو شاملِ تفتیش کر لوں؟"

"نہیں!" — اُس نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا — "میں اپنی بیوی اور بچوں پر شک نہیں کر سکتا۔"

"پھر آپ کے کسی بھائی نے یا کسی ایسے رشتے دار نے ریوالور چوری کیا ہے جس کا آنا جانا آپ کے گھر میں ہے۔"

"جناب تھانیدار صاحب!" — اُس نے کہا — "میرا خاندان چوروں کا خاندان نہیں۔"

"وہ جو کہتے ہیں کہ فوجی بیوقوف ہوتے ہیں وہ غلط نہیں کہتے" — مَیں نے کہا — "آپ بڑے اُونچے خاندان کے فرد ہو سکتے ہیں اور آپ بڑے افسر بھی ہو سکتے ہیں لیکن آپ میں عقل بہت کم ہے ... میں قتل کی تفتیش کر رہا ہوں، اس کے ساتھ ساتھ آپ کے ریوالور کی چوری کی بھی تفتیش شروع

کر دوں گا۔"

وہ سخت غصّے میں تھا بلکہ پھنکار رہا تھا۔

"آپ نے کہا ہے کہ آپ کو اپنی بیوی پر شک نہیں" — مَیں نے کہا — "لیکن میں نے آپ کی بیوی کے متعلق کچھ اور سُنا ہے۔"

"کیا سُنا ہے آپ نے؟" — اُس نے پوچھا۔

"آپ کی بیوی اُس لڑکے کو چاہتی تھی جو آج ریوالور کی گولی سے قتل ہو گیا ہے" — میں نے کہا۔

"یہ بالکل جھوٹ ہے" — اُس نے بڑی غصیلی آواز میں جواب دیا — "میری بیوی میرے سوا کسی کو نہیں چاہتی۔ کیا مجھ میں آپ کو کوئی کمی نظر آتی ہے؟ کیا میں بدصورت ہوں؟ کیا میرا جسم آپ کو کمزور نظر آتا ہے؟ یہ لڑکی تو خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ اُسے مجھ جیسا خاوند مل گیا ہے جو ہر لحاظ سے ٹھیک ہونے کے علاوہ فوج میں سردار ہے۔"

اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل قدرتی تھا یا آپ یوں کہہ لیں کہ مرد کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ اس جمعدار جیسا کوئی بھی مرد یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کی بیوی اُسے نہیں چاہتی۔ مجھے پہلے ہی مصدقہ شہادت مل چکی تھی کہ رانی مقتول کو شادی کے بعد بھی ملتی تھی۔ ایک تو اس جمعدار نے اپنے آپ کو دھوکہ دے رکھا تھا کہ رانی اُسے چاہتی ہے اور مجھے یہ شک بھی ہُوا کہ رانی اُسے یہی تاثر دیتی ہو گی کہ وہ اُس کے ساتھ بہت خوش ہے۔ میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ جمعدار عقل سے خالی ہے۔

"جمعدار صاحب!" — میں نے کہا — "اب میں جو کچھ پوچھوں وہ بالکل صحیح اور سچ بتا دینا۔"

"مجھے ایک بات بتا دیں" — اُس نے کہا — "آپ نے مجھے کس شک میں پکڑ لیا ہے؟ کیا آپ کو یہ شک ہے کہ اس لڑکے کو میں نے قتل کیا ہے؟"

"شک نہیں جمعدار صاحب!" — میں نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ اس

لڑکے کے قاتل آپ ہیں"۔

جس طرح وہ تڑپا اور اُچھلا وہ دیکھنے والا تھا۔ وہ اُچھل اُچھل کر قتل کے الزام سے انکار کرتا تھا۔ میں اُس کی اُچھل کود دیکھتا رہا۔ وہ جب ٹھنڈا ہُوا تو میں نے اُس کے ساتھ مزید باتیں کیں۔

"کیا آپ نے شیرے کے بڑے بھائی کو یہ نہیں کہا تھا کہ شیرا آپ کی بیوی سے ملتا ملاتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"یہ آپ کو کسی نے بالکل غلط بتایا ہے" — اُس نے کہا — "میں نے اُسے یہ کہا تھا کہ اپنے بھائی کو لگام ڈالو"۔

"یہ کیوں کہا تھا؟" — مَیں نے پوچھا۔

"مجھے شک ہُوا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"شک کیوں ہُوا تھا؟"

"مجھے پتہ چلا تھا کہ شیرا اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا" — اُس نے جواب دیا — "لیکن اس لڑکی کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔ میں اب چھٹی آیا تو میں نے اس لڑکے کو اپنے گھر کے سامنے گھومتے پھرتے دیکھا پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ میری بیوی اپنے گھر جا رہی تھی تو یہ لڑکا اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا..... میں نے اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔ میری بیوی نے اس لڑکے کو بہت گالیاں دی تھیں اور وہ کہتی تھی کہ کسی روز میں خود اس لڑکے کے سر پر جُوتا ماروں گی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جہاں وہ تمہیں چھیڑے وہیں رُک کر اُس کے مُنہ پر جُوتا مارنا پھر دیکھنا کہ میں اس لڑکے کا کیا بناتا ہوں"۔

"جمعدار صاحب!" — میں نے کہا — "اگر میں آپ کو یہ کہوں کہ شیرا آپ کی غیر حاضری میں کبھی کبھی رات کو آپ کے گھر جاتا تھا تو آپ کیا کہیں گے؟"

"ایسا ہو نہیں سکتا" — اُس نے کہا — "اگر مجھے ذرا سا شک بھی ہوتا تو میں اس لڑکے کو اُسی روز ختم کر دیتا"۔

"وہ تو آپ نے کہہ ہی دیا ہے جمعدار صاحب!" — میں نے کہا۔

"میں کہتا ہوں مجھ پر بار بار یہ الزام نہ لگائیں" — اُس نے کہا — "یہاں بے شمار آدمی جانتے ہیں کہ میں کل صبح سے گاؤں سے غیر حاضر ہوں۔ میں صبح تقریباً ساڑھے چار بجے گھر سے نکل گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں"۔

"میں جانتا ہوں" — میں نے کہا — "لڑکا گاؤں میں تو قتل نہیں ہُوا، وہ گاؤں سے باہر مارا گیا ہے..... آپ کس طرف شکار کو گئے تھے؟"

اُس نے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہ گاؤں اُسی طرف تھا جائے واردات سے تو دُور تھا لیکن راستہ وہی تھا جس کے قریب مقتول کی لاش پائی گئی تھی۔

"وہ میری پلٹن کے ایک حوالدار میجر کا گاؤں ہے" — جمعدار نے کہا — "وہ بھی چھٹی آیا ہُوا ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں کسی روز بندوق لے کر آؤں گا اور ہرن کے شکار کے لئے چلیں گے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ اس گاؤں سے تقریباً تین میل آگے علاقہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے"۔

"ہاں، میں جانتا ہوں" — میں نے کہا — "وہاں ہرن مل جاتے ہیں"۔

"لیکن بہت تھوڑے ہیں" — جمعدار نے کہا۔

"جمعدار صاحب!" — میں نے کہا — "مجھے شکار کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ میرے مطلب کی بات کریں۔ آپ اپنے دوست کے گھر چلے گئے پھر کیا ہُوا؟..... مقتول آپ کو کہاں ملا تھا؟"

"کہیں بھی نہیں جناب!" — اُس نے جھنجھلا کر کہا — "اُس نے مجھے کہاں ملنا تھا۔ میں اس حوالدار میجر کے گاؤں چلا گیا۔ اُس روز یعنی کل ہم نے پرندوں کا شکار کھیلا پھر صبح جب ابھی اندھیرا تھا ہم ہرن کے شکار کے لئے گئے۔ ہرن سورج نکلنے سے پہلے مل سکتے تھے۔ ہمیں کوئی ہرن نہ ملا۔ ہم اور آگے چلے گئے۔ دو خرگوش مارے، بہت سے پرندے مارے۔ دن کے پچھلے پہر میں واپس چل پڑا۔ میں اُس جگہ پہنچا جہاں شیرے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں

تین لڑکے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں ایک جوان لڑکے کی لاش پڑی ہوئی تھی اور پولیس آئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکا ہمارے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہاں آیا تو پورا پتہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ شیرا پستول کی گولی سے مرا ہے۔"

پیار کے جال میں

جس طرح جمعدار قتل کے الزام سے انکار کرتا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے لیکن اس کے ریوالور کا غائب ہو جانا میرے شک کو پختہ کرتا تھا۔ اگر کوئی آدمی ریوالور چوری کرتا تو ریوالور کے ساتھ گولیوں والی بیلٹ بھی ساتھ لے جاتا۔ وہ صرف چھ گولیاں ساتھ لے گیا۔ یہی ایک صورت میرے سامنے آتی تھی کہ جمعدار ریوالور میں چھ گولیاں ڈال کر ساتھ لے گیا تھا۔ اگر وہ بیلٹ کندھے سے لٹکا کر لے جاتا تو یہ اس کے خلاف شہادت ہوتی کہ وہ ریوالور ساتھ لے گیا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ریوالور میں چھ گولیاں ڈال کر اور چھپا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میں نے اس پر مزید سوال اور جرح روک لی۔ میں نے سوچا کہ ادھر ادھر سے اس کے خلاف شہادت اکٹھی کر لوں پھر اس کے ساتھ بات کروں گا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر جمعدار کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک کانسٹیبل کو بلا کر جمعدار کے دوست حوالدار میجر کا نام اور اس کے گاؤں کا نام بتایا اور کہا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔

میں نے اپنے مخبروں کو بلایا۔ یہ گاؤں کے معزز افراد تھے۔ یہ تین تھے۔ انہیں باری باری اندر بلایا اور ان سے کچھ باتیں پوچھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ میں اس سلسلے میں گاؤں کے چوکیدار سے بھی پوچھوں۔ میں نے چوکیدار کو بھی بلایا اور اس سے پوچھا۔ اس نے کچھ باتیں وہ بتائیں جو

اس کی چشم دید تھیں اور کچھ باتیں اس نے اپنی بیوی کے حوالے سے بتائیں۔ ان سب سے جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں وہ مختصراً یہ تھیں:

کچھ تو میں آپ کو کسی نہ کسی کی زبانی کہی باتیں بتا چکا ہوں۔ ان باتوں کی اب تصدیق ہو گئی اور ان سے جمعدار کے بیان کے کچھ حصے کی تردید بھی ہو گئی۔ جمعدار نے کہا تھا کہ اس کی بیوی مقتول کو گالیاں دیتی تھی اور وہ صرف جمعدار کو چاہتی تھی۔ ان سب نے مجھے بتایا کہ مقتول اور رابی کا معاشقہ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ان سب نے یہ بات متفقہ طور پر کہی کہ رابی گھر میں اکثر روتی رہتی تھی اور وہ جمعدار کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔

چوکیدار نے مجھے بتایا کہ دو مرتبہ آدھی رات کے بعد اس نے مقتول کو جمعدار کے گھر کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ چوکیدار کی بیوی نے چوکیدار کو بتایا تھا کہ جمعدار کی بیوی اور مقتول باہر بھی کہیں ملتے ملاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کے درمیان پیغام رسانی چوکیدار کی بیوی کے ذریعے ہوتی تھی۔ رابی جمعدار کے بچوں کے ساتھ بہت پیار کرتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ بچوں کو اپنے پیار کے جال میں پھنسائے رکھنا چاہتی تھی تاکہ وہ اس کی جاسوسی یا مخبری نہ کریں۔ وہ ان کے ساتھ بچوں کی طرح ہنستی کھیلتی رہتی تھی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس کے سوتیلے بچے ہیں۔ جمعدار کے ساتھ بھی اس کا سلوک اور برتاؤ ایسا تھا جیسے وہ جمعدار کی محبت میں پاگل ہوتی جا رہی ہو لیکن یہ اس لڑکی کی فریب کاری تھی۔

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کس کی بیوی کس کو چاہتی ہے۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جمعدار کی بیوی جمعدار کو نہیں بلکہ مقتول کو چاہتی تھی اور جمعدار کو پتہ چل گیا کہ ان کی آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔

میں نے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ جانتے ہوتے کہ رابی کا دل کہیں اور ہے جمعدار رابی پر بھروسہ کیوں کرتا تھا۔ میں نے معلوم کرنا تھا کہ جمعدار کا رویہ

رابی کے ساتھ کیا تھا۔ اس سوال کا جواب مجھے اِن لوگوں سے مل گیا۔ ایک تو اُنہوں نے یہ بتایا تھا کہ رابی روتی رہتی ہے اور وہ جمعدار کو پسند نہیں کرتی۔ پھر اُنہوں نے یہ بتایا کہ جمعدار رابی پر بہت سختی کرتا ہے۔

جمعدار نے شادی کی تھی تو اُس وقت وہ پندرہ دِنوں کی چھٹی آیا تھا۔ چار پانچ مہینوں بعد وہ سات دِنوں کی چھٹی پر آیا اور اب وہ ڈیڑھ مہینہ کی چھٹی پر آیا ہُوا تھا۔ یہ اُس کی حماقت تھی کہ اُس نے اپنی نوجوان بیوی کو اکیلا گھر میں چھوڑا ہُوا تھا۔ رابی کو اپنے والدین کے گھر جانے کی اجازت تھی جو اسی گاؤں میں رہتے تھے لیکن وہ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دو دن وہاں رہ سکتی تھی۔

اِن سب نے بتایا کہ جمعدار نے رابی کو مارا پیٹا بھی تھا لیکن اُنہیں اس کا یقین نہیں تھا یہ سُنی سنائی بات تھی، البتہ یہ سب کو یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ جمعدار رابی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا اور اُسے دبا کر رکھتا تھا۔

تفتیش میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس پر قتل کا شُبہ کیا جا رہا ہے اُس میں قتل کرنے کی ہمت اور جرأت ہے یا نہیں۔ اس جمعدار کے متعلق یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اُس میں وہ تمام وصف موجود تھے جن کا کسی قاتل میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اُس میں غصّہ بھی تھا، جسمانی طاقت زیادہ اور عقل کم تھی اور وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا حاکم سمجھتا تھا جسے کوئی پکڑ ہی نہ سکتا ہو۔ میری نگاہ میں قاتل وہی تھا۔ مجھے شہادت اور ثبوت کی ضرورت تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ اُس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے تفتیش کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ میرا دماغ تھک گیا تھا۔ میں نہایا دھویا، نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور تقریباً ایک گھنٹہ سویا رہا۔ اس سے میرا دماغ کچھ تازہ ہو گیا۔ میں نے رابی کو بلوا بھیجا۔ اتنے میں لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی۔ گاؤں میں جو کہرام مچا ہو گا اُس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ مقتول بڑا خوبصورت

نوجوان تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ یہ تھی کہ گولی ناف کے دائیں طرف اور ذرا نیچے سے جسم میں داخل ہوئی تھی۔ گولی اُوپر کو گئی۔ اس سے انتڑیاں اور معدہ کٹا پھر اس گولی نے دل کے بالکل نیچے سے دل کو کاٹا اور گولی کندھے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس سے موت واقع ہوئی۔

یہ رائے ماہرین نے دینی تھی کہ گولی کتنے فاصلے سے فائر ہوئی لیکن اتنی سی رائے تو میں خود بھی دے سکتا تھا کہ یہ گولی بہت قریب سے فائر کی گئی تھی۔ قریب سے مراد ایک گز یا زیادہ سے زیادہ دو گز کا فاصلہ ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ گولی دُور سے آتی تو پیٹ اور اندر کے دیگر نرم اعضاء کو کاٹ دیتی لیکن ہڈی کو نہ توڑ سکتی نہ اس میں سے گزر سکتی اور جسم کے اندر رہی رہتی۔

محبت روح میں اُتر گئی تھی

رابی کو میرے پاس لایا گیا۔ میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ رابی بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کا قد لمبا اور نہایت موزوں اور رنگ گورا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور ناک کا نیچے والا حصّہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت روتی رہی ہے۔ میرے سامنے آ کر اُس کے چہرے پر غم کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی آ گئی۔ کوئی بھی مشتبہ، ملزم یا گواہ پولیس کے سامنے آتا ہے تو وہ سوچ لیتا ہے کہ تھانے دار کیا پوچھے گا اور وہ کیا جواب دے گا۔ میں جانتا تھا کہ اس لڑکی نے بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہو گا لیکن میں نے اپنی عادت کے مطابق اُسے کسی اور راستے پر چڑھا دیا۔

"اتنا نہ گھبراؤ رابی!" — میں نے شفقت کے لہجے میں کہا — "تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اگر تمہارا کوئی قصور ہو گا بھی تو میں اُس پر پردہ ڈال دوں گا۔ ڈرو نہیں۔"

اُس نے یہ چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا جیسے میں نے اُسے گالی دے دی ہو۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو" —— میں نے کہا —— "تم حیران ہو رہی ہو کہ ایک تھانیدار اس طرح کی بات کیوں کہہ رہا ہے۔ میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں.... میں کل کا یہاں آیا ہُوا ہوں۔ اس وقت تک میں بہت سے لوگوں سے تمہارے متعلق، تمہارے خاوند اور شیرے کے متعلق سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ سب نے کہا ہے کہ رابی پر بہت ظلم ہُوا ہے۔ میں مان گیا ہوں کہ تمہارے ماں باپ نے تمہاری شادی اس وحشی جمعدار کے ساتھ کرا کے اچھا نہیں کیا۔ میں ہوتا تو تمہاری شادی شیرے کے ساتھ کراتا۔"

اس لڑکی کا ردِّعمل یہ تھا کہ اُس کے آنسو بہنے لگے پھر اُس کی سِسکیاں نکلنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ میں نے شفقت، پیار اور ہمدردی کی باتیں جاری رکھیں، کچھ دیر بعد وہ سنبھل گئی۔

میں اُس کے بیان کو اتنا لمبا بیان نہیں کروں گا۔ میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ میں جو کچھ بھی پوچھوں وہ ٹھیک ٹھیک بتاتی چلے۔ میں نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اُس کا اگر کوئی جُرم یا قصور ہُوا تو میں اُس پر پردہ ڈال دوں گا۔ میری محنت اور میری اُستادی ضائع نہیں ہوتی تھی۔ وہ گاؤں کی سیدھی سی لڑکی تھی۔ اُسے اپنے ہاتھ میں لینا میرے لئے یا کسی بھی تھانیدار کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس لڑکی کی تو یہ حالت تھی جیسے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی اور وہ خلاء میں لٹک رہی تھی۔ میں نے اُسے سنبھال لیا تھا یا یوں کہیں کہ میں نے اُسے ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔

میں نے اُس پر سوال کرنے شروع کر دیتے اور وہ جواب دینے لگی۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ شیرے کو صرف چاہتی ہی نہیں تھی بلکہ شیرے کی

محبت اُس کی روح میں اُتر گئی تھی۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جمعدار کو اُس نے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جمعدار کے ساتھ شادی کے بعد بھی وہ شیرے سے ملتی رہی ہے لیکن اُس نے یہ تسلیم نہ کیا کہ شیرا اُس کی غیر حاضری میں رات کو اُس کے گھر جاتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُس سے یہ بات منوالوں لیکن وہ نہ مانی۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے!" —— اُس نے کہا —— "گھر میں دو بچے ہیں۔ بڑا بچہ گیارہ بارہ سال کا ہے۔ شیرا رات کو میرے گھر کبھی نہیں آیا تھا۔"

"کیا جمعدار نے تمہیں کبھی مارا پیٹا بھی ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں!" —— اُس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا —— "اُس نے مجھے کبھی مارا پیٹا نہیں۔"

"کیا تم نے اپنے خاوند کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ تم اُسے چاہتی ہو اور شیرے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

"جی ہاں!" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ یہ تو مانتا تھا کہ میں اُسے چاہتی ہوں لیکن یہ نہیں مانتا تھا کہ میں شیرے کو نہیں چاہتی۔ یہ شک اُس کے دل میں موجود رہتا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے خاوند کی شیرے کے باپ اور بھائیوں سے تلخ کلامی ہوئی تھی۔"

"ہاں جی، مجھے معلوم ہے" —— وہ میری پوری بات سُنے بغیر بول پڑی —— "اگر لوگ ان کے درمیان نہ آجاتے تو خون بہہ جاتا۔"

"کیا تمہارے خاوند نے تمہیں شیرے کے ساتھ کہیں دیکھ لیا تھا؟"

میرے اس سوال سے وہ کچھ گھبرائی لیکن جلدی سنبھل گئی۔

"نہیں جی!" —— اُس نے کہا —— "کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔"

"تمہارے خاوند کا ریوالور کہاں گیا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — اُس نے جواب دیا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ ریوالور تمہارا خاوند خود لے گیا تھا تو تم کیا کہو گی؟"

"میں بھی یہی کہتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "میں تو یہ بھی کہتی ہوں کہ شیرے کو اسی نے اپنے ریوالور سے مارا ہے۔"

"ذرا سوچ کر بتاؤ" — میں نے کہا — "کل شام جب وہ گھر آیا تو تم نے اُسے بتایا کہ تھانیدار کا بلاوا آیا ہے تو کیا ایسا ہُوا تھا کہ جمعدار کسی کمرے میں گیا ہو؟ .... مجھے شک ہے کہ اُس نے ریوالور کہیں چھپا دیا ہو گا۔"

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے بندوق اور تھیلا مجھے دیا اور کہنے لگا کہ میں تھانیدار کی بات سُن کر آتا ہوں۔ وہ کسی کمرے میں نہیں گیا تھا۔"

"گھر میں کوئی اور آدمی آیا کرتا تھا؟" — میں نے پوچھا — "میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسا رشتہ دار گھر میں آتا ہو گا جو تمہاری نظر بچا کر ریوالور اور چھ گولیاں نکال کر لے گیا۔"

"میرے گھر میں کوئی آدمی نہیں آتا" — رابی نے جواب دیا — "کوئی عورت آجاتی ہے تو وہ میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ میں ٹرنکوں کی چابیاں ایسی جگہ چھپا کر رکھتی ہوں جو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ بچّوں کو بھی معلوم نہیں۔"

اس لڑکی کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ریوالور جمعدار خود لے گیا تھا اور اُس نے کہیں چھپا دیا ہے لیکن میں لڑکی کی ہر بات کو سچ نہیں مان سکتا تھا کیونکہ مقتول اُس کا محبوب تھا اور جس کی وہ بیوی تھی اُسے وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس لڑکی پر مکمل طور پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے بیان کی تصدیق یا تردید لازمی تھی۔

اس گھر میں دو بچے بھی تھے جنہیں میں نے پہلے ہی ذہن میں رکھا ہُوا تھا۔ اب مجھے ان بچّوں کی ضرورت تھی۔ بچے معصومیت اور بھولے پن

میں بڑے کام کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں۔ میں نے "حکایت" میں ایک لطیفہ پڑھا تھا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہتی ہے کہ بچّوں میں یہ خرابی ہے کہ سچ بات کہہ دیتے ہیں۔ دوسری عورت کہتی ہے کہ بچّوں میں اصل خرابی یہ ہے کہ غلط موقع پر سچ بول دیتے ہیں۔ یہ لطیفہ ہے لیکن ہے بالکل حقیقت۔

میں نے جمعدار کے بیٹے کو بلوا بھیجا۔

رحمت اور محبّت کا جعلی فرشتہ

بچہ جب میرے سامنے آیا تو وہ مجھے بڑا پیارا لگا۔ رابی کو میں نے باہر بٹھا دیا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا تھا کہ اسے بالکل الگ بٹھائے اور خاص کر جمعدار سے بچا کر رکھے۔ میں نے بچے کو اپنے بازوؤں میں لے کر گلے لگایا اور اُس سے پیار کیا۔ اُس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگا۔

"تمہاری امی کیسی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"امی نہیں تھی" — اُس نے کہا — "وہ ماں جی تھی۔ امی یہ ہے.... ماں جی بھی اچھی تھی امی بھی اچھی ہے۔"

"دونوں میں سے کون اچھی ہے؟"

"ماں جی مر گئی ہے" — اُس نے جواب دیا — "اس امی کو میں نہیں مرنے دوں گا۔"

بچے کا اندازہ یہ تھا کہ وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا نہیں تھا۔ میری کوئی چیز اُسے نظر آتی تھی تو اُسے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ میں اُس کے ساتھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے میں تفتیش نہیں کر رہا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے بٹھا کر پابند نہ کروں۔ اُسے میری بیلٹ نظر آگئی جو میرے قریب دیوار کے ساتھ لٹکی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ریوالور تھا۔ بچہ اُس کے پاس جا کھڑا ہُوا اور پوچھ

میں پڑے ہوئے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

"یہ پستول آپ کا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" — میں نے کہا — "یہ میرا ہے۔ تمہارے ابا کا بھی پستول ہے؟"

"ہاں!" — اُس نے کہا — "وہ بھی ایسا ہی ہے.... اس سے چھوٹا ہے۔"

"تمہارا ابا کہتا ہے وہ کوئی لے گیا ہے" — میں نے کہا — "تمہیں پتہ ہے کون لے گیا ہے؟"

"پتہ نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ابا مجھے اور امی کو اور میری بہن کو گالیاں دیتا تھا کہ پستول کدھر کر دیا ہے۔"

"تمہارا ابا تمہاری امی کو مارتا کیوں ہے؟"

"ابا نے امی کو دو دفعہ مارا تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ امی کو اندر لے گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوتی تھی کہ ابا نے امی کو مارا اور امی باہر آکر روتی رہی۔"

"تم اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے اور میری بہن کو ابا نے کہا تھا کہ اندر نہ آنا۔"

"ابا کچھ تو کہتا ہوگا!"

"چار پانچ دن ہوئے ابا نے امی کو مارا تھا" — بچے نے کہا — "میں برآمدے میں تھا۔ ابا کہہ رہا تھا کہ اب اُس کو کہنا کہ یہاں آئے۔ ابا یہ بھی کہتا تھا کہ تم دونوں کی لاشیں دریا میں پھینک آؤں گا۔"

"تم نے ابا سے پوچھا نہیں تھا کہ یہاں کون آتا ہے جس کی لاش وہ دریا میں پھینک آئے گا؟"

"نہ جی!" — بچے نے کہا — "مَیں پوچھتا تو ابا مجھے بھی مارتا۔"

میں کبھی بچے کے سکول کی کبھی اُس کی دلچسپی کی کوئی بات اور کبھی اپنے مطلب کی کوئی بات پوچھ لیتا تھا۔ میں آپ کو ساری باتیں نہیں سُنا سکتا کیونکہ یہ بہت لمبی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں بچے کو اُس مقام پر لے آیا جہاں میں اُسے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ جمعدار کی غیر حاضری میں کبھی کبھی رات کو مقتول رابی کے پاس جاتا تھا۔

بچے نے میری باتوں میں آکر بتایا کہ ایک رات پہلے جب جمعدار شکار کے لئے اپنے دوست کے گاؤں گیا ہوا تھا، رات کو بچے کی آنکھ کھلی۔ وہ برآمدے میں سوتے ہوئے تھے۔ بچے نے دیکھا کہ رابی اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ بچے کو ڈیوڑھی میں کسی کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ آواز اونچی نہیں تھی۔ رابی باہر والا دروازہ بند کر کے ڈیوڑھی سے برآمدے میں آئی تو بچے نے اُس سے پوچھا کہ وہ ڈیوڑھی میں کس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

"باہر کوئی آدمی اور عورت باتیں کرتے جا رہے تھے" — رابی نے بچے کو جواب دیا — "میں پیشاب کرنے گئی تھی۔ سو جاؤ۔"

مَیں نے بچے سے کرید کرید کر پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز اچھی طرح سُنی تھی۔ بچے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آدھی رات سے پہلے کا واقعہ ہے یا بعد کا۔ اس سے مجھے شک سا ہوا۔ میں نے بچے کو باہر بھیج کر رابی کو بلایا۔

"رابی!" — میں نے اُسے کہا — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے اور اگر تمہارا کوئی جرم یا قصور میرے سامنے آیا تو میں اس پر پردہ ڈال دوں گا لیکن تم نے میرے آگے جھوٹ بولا ہے۔"

"نہ جی!" — اُس نے کہا — "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ شیرا کبھی رات کو بھی تمہارے گھر آیا ہے!" — میں نے کہا — "تم نے جواب دیا تھا کہ شیرا رات کے وقت تمہارے

گھر کبھی نہیں آیا۔ وہ کل رات تمہارے گھر آیا تھا"۔

وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی اور کچھ بھی نہ کہا۔

"کہہ دو یہ غلط ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "پھر میں تمہیں سچ ثابت کر کے دکھاؤں گا"۔

وہ پھر بھی چُپ رہی۔

"بولو رابی!" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر وہ رات کو تمہارے گھر گیا بھی ہے تو یہ کوئی جرم نہیں کہ میں تمہیں گرفتار کر لوں گا"۔

اُس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ میری ہمدردی اور شفقت کی باتوں کا بھی اُس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر اُس کے آنسو بہنے لگے۔ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ مقتول کی بجائے کوئی اور آدمی اس کے پاس آیا ہوگا۔

"رابی!" ــــ میں نے کہا ــــ "وہ کون تھا جو تمہارے پاس آیا تھا؛ وہ شیرا نہیں تھا تو کوئی اور تھا"۔

اچانک وہ بیدار ہوگئی۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

"میں ایسی بدکار نہیں کہ میرے پاس کوئی اور بھی آتا ہوگا" ــــ اُس نے کہا اور سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے سر جھکا لیا پھر سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔

"کیا آپ سچے دل سے میرے ساتھ ہمدردی کر رہے ہیں؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

ایسی بات مُشتبہ اُس وقت کہا یا پوچھا کرتا ہے جب وہ اقبالِ جُرم کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وہ تھانیدار سے وعدہ لیتا ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے گا یا وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا یا اُس کے خلاف جو مقدمہ تیار کیا جائے گا وہ کمزور رکھا جائے گا تاکہ وہ عدالت سے بری ہو سکے۔ اس مقام پر آکر تھانیدار اُس قسم کے ملزموں کے لئے رحمت کے فرشتے بن جاتے ہیں۔ کوئی بھی ملزم نہیں جان سکتا کہ تھانیدار رحمت اور محبت کا جعلی فرشتہ بن گیا ہے۔

رابی اسی مقام پر آگئی تھی۔ میں دلی طور پر اُس کا ہمدرد تھا لیکن اُس

نے اگر کوئی سنگین جرم کیا تھا تو پھر میری ہمدردی اپنے فرض کے ساتھ تھی جس کی مجھے تنخواہ ملتی تھی۔ ذرا اُس ماں کو تصور میں لائیں جس کا اتنا خوبصورت اور نوجوان بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ اس قتل کا باعث یہ لڑکی تھی۔ گو وہ قاتل نہیں تھی لیکن اُس میں جو تبدیلی آئی تھی اُس سے مجھے یہ شک ہونے لگا کہ اُس کے سینے میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے قاتل تک پہنچا سکتی ہے اور لڑکی یہ بات بتانے سے ڈر رہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہ اتنا ہی تسلیم کرے گی کہ مقتول رات کو اُس کے پاس جایا کرتا تھا۔ اُس کا یہ تسلیم کر لینا میرے لئے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔ یہ قتل کا باعث تھا جو مجھ پر پہلے ہی واضح ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے سینے سے کوئی اور بات نکالنے کے لئے ہمدردی اور خلوص کی ایسی باتیں اور ایسی ایکٹنگ کی کہ مجھے خود اپنے آپ پر شک ہونے لگا کہ میں مخلص ہمدرد اور شریف آدمی ہوں۔

بارُود دھماکے سے اُڑ گیا

میں نے جتنے بھی تیر چلائے وہ سب ٹھکانے پر لگے۔ میں نے ان میں سے کئی تیر ہوا میں چلائے تھے۔ وہ بھی ضائع نہ ہوتے۔ یہ میری اُستادی تو تھی لیکن لڑکی دیہاتن تھی اور دوسرے یہ کہ اُس کے جذبات میں طوفان آیا ہوا تھا اور تیسرے یہ کہ وہ پولیس کے قبضے میں تھی۔

"میں آپ کو ساری بات سنا دیتی ہوں" ــــ اُس نے کہا ــــ "شیرا کبھی کبھی رات کو میرے پاس آیا کرتا تھا۔ میں اُسے خود کہیں اشارہ کر دیتی تھی کہ آج رات کو آنا یا چوکیدار کی بیوی کی زبانی اُسے پیغام بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ آدھی رات کو آیا کرتا تھا۔ میں اُس رات باہر والا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا کرتی تھی"۔

اُس نے بہت قسمیں کھا کر کہا کہ اُس کی اور شیرے کی محبت بالکل پاک تھی اور وہ ڈیوڑھی میں بیٹھ کر دل کی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے اس کے ساتھ

کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان کی محبت پاک تھی یا ناپاک۔ میں نے بہرحال اس لڑکی کو خوب ہوا دی اور ایسی باتیں کہیں کہ انہیں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے کی صف میں کھڑا کر دیا۔

"وہ جو میرے خاوند اور شیرے کے بھائی میں جو لڑائی جھگڑا ہوا تھا اور دونوں طرف کے آدمی لڑائی کے لئے نکل آتے تھے اُس کی ایک وجہ تھی" —اُس نے کہا— "ایک روز پہلے کی بات ہے میں بچوں کو سکول بھیج کر کھیتوں میں چلی گئی۔ میرا خاوند چھٹی آیا ہوا ہے۔ یہ کہیں باہر نکل گیا تھا۔ شیرے نے مجھے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تو وہ بھی آ گیا۔ ہم دونوں اُونچے فصل کی اوٹ میں اکٹھے ہوتے۔ خطرہ تھا کہ کوئی دیکھ لے گا اس لئے شیرا چلا گیا اور میں دوسری طرف چلی گئی ....

"گھر آئی تو خاوند نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ اُس وقت اپنے رشتہ دار کے چوبارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں سے اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اُس سے جان چھڑانے کے لئے یہ کہہ دیا کہ میں تو اس لڑکے کے ساتھ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑتا ہی نہیں ....

"اُس وقت تو معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن شام کو خاوند باہر سے آیا تو مجھے اندر لے گیا۔ دونوں بچوں کو اُس نے کہا کہ وہ باہر کھیلیں اندر نہ آئیں۔ میرے خاوند کو کسی نے بتا دیا تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں شیرا رات کو جب گاؤں والے سو جاتے ہیں میرے پاس آتا ہے۔ خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے۔ میں نے کہا یہ جھوٹ ہے۔ اس پر ہم دونوں میں بک بک ہوتی رہی پھر اُس نے میرے مُنہ پر تین چار تھپڑ مارے اور کہا کہ اب اُسے کہنا یہاں آئے۔ میں تم دونوں کی لاشیں دریا میں پھینک آؤں گا"

"اس سے پہلے بھی اُس نے کبھی تمہیں مارا تھا؟"

"دو دفعہ" —رابی نے جواب دیا— "اسی بات پر .... اُس وقت بھی یہ چھٹی آیا ہوا تھا"

"تم اب کی بات سُنا رہی تھیں" —میں نے کہا۔

"ویسے تو وہ میرے ساتھ بہت پیار کرتا ہے" —رابی نے کہا— "لیکن شیرے کا نام سُن کر میرا دشمن ہو جاتا ہے۔ میں نے دو دفعہ اُس سے تھپڑ کھاتے اور گالیاں بھی کھائیں لیکن اب تیسری دفعہ میں برداشت نہ کر سکی۔ میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ماں باپ نے یہ سوچ کر مجھے اُس کے ساتھ بیاہ دیا تھا کہ اُس کی زمینداری بھی ہے اور فوج میں جمعداری کا عہدہ بھی ہے اس لئے لڑکی سُکھی رہے گی۔ انہوں نے مجھے اس شخص کے ساتھ زبردستی نہیں باندھا تھا، انہوں نے میرا بھلا سوچا تھا۔ میں انہیں یہ کہہ کر پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی کہ یہ آدمی مجھ پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اب بھی انہیں بتانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میرا دماغ پھرنے لگا اور بار بار یہ ارادہ سامنے آنے لگا کہ اس خاوند کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا....

"چار پانچ دنوں بعد میرے خاوند نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایک دوست کے گاؤں جا رہا ہے۔ وہ شکار کے لئے جا رہا تھا اور اُس نے ایک دو راتیں اپنے دوست کے پاس رہنا تھا۔ وہ چلا گیا تو میں نے شیرے کو پیغام بھیجا کہ رات کو آئے۔ شیرا آ گیا۔ میں بہت روئی اور شیرے کو کہا کہ میں اب اس آدمی کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس سے آزاد ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے جان سے ہی مار دیا جائے"

ان لوگوں کے لئے کسی کو جان سے مار دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس لڑکی نے آگے جو بیان دیا وہ میں اپنے الفاظ میں سناؤں گا۔ اس کے ساتھ اپنا تجزیہ اور رائے بھی پیش کرتا جاؤں گا۔ ان دونوں کی عمروں پر غور کریں۔ شیرے کی عمر سترہ سال تھی اور رابی اُنیس یا بیس سال کی تھی۔ یہ نادان عمر تھی جس میں عقل پر جذبات کا غلبہ ہوتا ہے اور فطرت بارود کی طرح ہوتی ہے۔ ذرا سا شرارہ ملا تو بارود دھماکے سے اُڑ گیا اور جو چیز قریب ہوتی اُسے بھی اُڑا دیا۔ ان دونوں کے جذبات تو بہت ہی زیادہ مشتعل تھے، پھر یہ دیہاتی

اور اَن پڑھ تھے اور ایسی قوم کے فرد تھے جو للکارنے اور للکار کا جواب للکار سے دینے کی عادی تھی۔

شیرے نے کہا کہ وہ زہر لائے گا اور رابی جمعدار کو زہر پلائے گی۔ رابی انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ وہ زہر پلانے کے لئے تیار ہو گئی لیکن شیرے نے کہا کہ وہ پکڑی جائے گی اور اُس نے یہ بھی کہا کہ مرد کو جان سے مارنا مرد کا کام ہے۔ وہ خود یہ کام کرے گا۔ شیرے کو اُمید تھی کہ جمعدار دنیا میں نہ رہا تو وہ اپنے والدین کو مجبور کر دے گا کہ اُس کی شادی رابی کے ساتھ کر دیں۔ رابی نے کہا کہ اُس کی شادی شیرے کے ساتھ نہ ہو سکی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ یہ سُن کر شیرا بھڑک اُٹھا۔ وہ تو یہ سُن کر پہلے ہی بھڑکا ہوا تھا کہ جمعدار نے رابی کو تھپڑ مارے ہیں۔

دونوں قتل کا ایسا طریقہ سوچنے لگے جس سے قاتل کا سراغ نہ ملے۔ رابی نے مجھے دو تین طریقے سنائے لیکن ان میں پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ شیرے کا دھیان اس طرف گیا کہ جمعدار شکار کھیلنے گیا ہے۔ اُس نے رابی کو وہ جگہ بھی بتائی تھی جہاں کبھی کبھی ایک دو ہرن نظر آتے ہیں۔

"میں وہ علاقہ جانتا ہوں" — شیرے نے کہا — "اگر مجھے بندوق مل جائے تو میں وہاں چلا جاؤں اور اس جمعدار کو تلاش کر کے اور چھُپ کر اُسے گولی مار دوں اور چھپتا چھپاتا وہاں سے نکل آؤں لیکن بندوق نہیں ملے گی۔"

"پستول لے جاؤ" — رابی نے کہا — "اندر ٹرنک میں پڑا ہے .... لیکن نہیں شیرے انہیں وہاں کوئی دیکھ لے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے" — شیرے نے کہا — "پستول نیفے میں اُڑس لوں گا۔ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اُس علاقے میں چھوٹی بڑی پہاڑیاں ہیں اور درختوں کا جنگل ہے۔ میں وہاں چلا جاؤں گا۔ اگر وہ مجھے نظر آ گیا تو چھُپ کر اُس پر گولی چلا دوں گا۔ تم پستول نکالو۔"

عزّت پر ہاتھ ڈالا

مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ شیرے نے ریوالور کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ریوالور میں گولیاں کس طرح ڈالی جاتی ہیں۔ اُسے اتنا ہی معلوم تھا کہ "گھوڑا" دبانے سے گولی فائر ہوتی ہے۔ گھوڑا ٹریگر کو کہتے تھے۔ جمعدار نے پیار پیار میں رابی کو ریوالور لوڈ کرنا یعنی اس کے سیلنڈر میں گولیاں ڈالنا سکھایا تھا اور اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ گولی کس طرح فائر کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہ ایک گولی فائر ہو جاتی ہے تو سیلنڈر خود ہی گھوم کر دوسری گولی کو نالی کے سامنے لے آتا ہے۔ جمعدار نے اُسے گولی چلا کر نہیں دکھائی تھی۔ اُسے شست باندھنا سکھایا تھا۔

جذبات کے مارے ہوئے ان دو احمقوں نے قتل کا پلان یہ بنایا کہ رابی جمعدار کے ریوالور میں چھ گولیاں بھر کر شیرے کو دے دے گی۔ شیرا وہاں چلا جائے گا جہاں جمعدار اپنے دوست کے ساتھ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ شیرا چھُپ کر جمعدار کو دیکھے گا۔ وہ اُسے نظر آ گیا تو چھُپ کر جمعدار پر گولی چلا دے گا۔ اس گولی کے دھماکے کو شکاری کی بندوق کا دھماکہ سمجھا جائے گا اور وہاں کوئی اور لوگ ہوئے تو کسی کو شک نہیں ہو گا۔ شیرا ریوالور نیفے میں اُڑس کر واپس آ جائے گا اور ریوالور رابی کو دے دے گا اور رابی ریوالور واپس توچ میں ڈال کر ٹرنک میں رکھ دے گی اور اس طرح قاتل کا سراغ نہیں ملے گا۔

ایک وہ قتل ہوتا ہے جسے نفسیات کے ڈاکٹر "ایک لمحے کا پاگل پن" کہتے ہیں۔ پولیس اور قانون کی زبان میں اسے فوری اشتعال کہتے ہیں۔ کسی وجہ سے اتنا زیادہ اشتعال اور اتنا زیادہ غصّہ آ گیا کہ دماغ ماؤف ہو گیا اور درندگی غالب آ گئی۔ یہ ایسا پاگل پن ہے جس کا نتیجہ قتل ہوتا ہے۔ یہ قتل کوئی بزدل اور کوئی انتہائی شریف آدمی بھی کر سکتا ہے۔

ایک قتل باقاعدہ منصوبہ یعنی پلان بنا کر کیا جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح رابی اور شیرے نے بنایا تھا لیکن پلان تیار کرنے کے لئے خاص قسم کے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کامیاب پلان کوئی پیشہ ور قاتل ہی بنا سکتا ہے یا وہ آدمی جو جانتا ہو کہ پولیس تفتیش اور سراغرسانی میں کن چیزوں کو دیکھتی ہے۔ قتل کی واردات میں پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے غیر معمولی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

رابی اور شیرے میں غیر معمولی عقل کہاں سے آتی، ان میں معمولی سی عقل بھی نہیں تھی اور اگر کچھ عقل تھی تو اس پر جذبات کا اور انتقام کے غصے کا آسیب سوار تھا۔

رابی شیرے کو اندر لے گئی۔ دونوں بچے گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ ٹرنکوں والے کمرے میں جا کر رابی نے لالٹین جلائی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے ٹرنک کھولا ریوالور اور گولیوں والی بیلٹ نکالی۔ اس میں سے ریوالور نکالا اور اس کا سیلنڈر باہر نکال کر بیلٹ میں سے چھ گولیاں کھینچیں اور یہ سیلنڈر میں ڈال کر سیلنڈر بند کر دیا۔ اس نے ریوالور شیرے کے ہاتھ میں دے کر بازو آگے کو لمبا کیا اور ریوالور کی نالی پہ دو جگہ انگلی رکھ کر اسے بتایا کہ شست کس طرح لی جاتی ہے۔ پھر اسے بتایا کہ گولی کس طرح فائر کی جاتی ہے۔

"اس گھوڑے (ٹریگر) کو ویسے ہی نہ دبا دینا" — رابی نے شیرے سے کہا — "ورنہ گولی چل جائے گی۔ شست صحیح لے کر گھوڑا دبانا۔"

رابی کو معلوم نہیں تھا کہ ریوالور کی گولی نشانے پر مارنے کے لئے کتنی زیادہ مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر بازو آگے کو کیا جاتا ہے جب ٹریگر دبایا جاتا ہے تو ریوالور کی نالی بھی آگے سے نیچے ہو جاتی ہے۔ اس لئے گولی نیچے چلی جاتی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شیرا نشانے پر گولی چلا سکتا۔ دونوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ریوالور سے کتنی دور تک

گولی پورا اثر کرتی ہے۔ ریوالور کا رینج زیادہ نہیں ہوتا۔ انہیں یقین تھا کہ جس آدمی کی طرف ریوالور کی نالی کر کے فائر کر دو وہ آدمی مر جاتا ہے۔

شیرا ریوالور نیفے میں اڑس کر چل پڑا۔ رابی نے بیلٹ ریوالور اور چھ گولیوں کے بغیر ٹرنک میں وہیں رکھ دی تھی جہاں سے اٹھائی تھی۔ لالٹین بجھا کر وہ ڈیوڑھی میں گئی اور شیرے سے کہا کہ اسے جمعدار کہیں نظر نہ آئے تو وہ واپس آ جائے اور رات کو جب سب سو جائیں تو وہ ریوالور واپس دے جائے۔

"شیرا چلا گیا" — رابی نے کہا — "میں باقی رات سوئی نہیں۔ دل پر بوجھ پڑ گیا تھا اور گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی دل اتنا زیادہ گھبرانے لگتا کہ میں ارادہ کر لیتی کہ صبح ہوتے ہی شیرے کے گھر کسی بہانے چلی جاؤں گی اور اسے اشارہ کروں گی کہ وہ میرے خاوند کے پیچھے نہ جائے۔ مجھے ڈر صرف یہ تھا کہ شیرا پکڑا جائے گا لیکن یہ سوچ آ جاتی کہ شیرے کے گھر تو میں جا ہی نہیں سکتی کیونکہ ان کے ساتھ میرے خاوند کی لڑائی تھی۔ پھر خیال آتا کہ اس جمعدار کو زندہ نہیں رہنے دینا....

"رات گزری۔ صبح گھبراہٹ اور بے چینی رات سے بھی زیادہ تھی۔ ہاتھ کانپتے تھے۔ بات کرتی تھی تو زبان کانپتی تھی۔ رات کو تو یہ خیال آتے رہے کہ میں نے شیرے کو پستول دے کر اچھا کیا ہے اور کبھی خیال آتا کہ اچھا نہیں کیا لیکن دن کی روشنی میں تو یہی ایک خوف سوار ہو گیا کہ میں لے اچھا نہیں کیا اور شیرا پکڑا جائے گا اور میں بھی پکڑی جاؤں گی کہ پستول میں نے نکال کر دیا تھا.... قسم کھا کر کہتی ہوں، مجھے اپنا کوئی غم نہیں تھا۔ اس گھر سے تو جیل خانہ اچھا تھا۔ میں صرف یہ دعا کرتی تھی کہ شیرے کو کچھ نہ ہو....

"مجھے جب پتہ چلا کہ کسی جگہ شیرے کی لاش ملی ہے تو میں اس وقت کھڑی تھی۔ مجھے چکر آیا اور میں نے دروازے کا کواڑ پکڑ لیا۔ معلوم نہیں میں زندہ کس طرح رہی۔ پھر ایسے ہوا کہ میرا غم یکلخت ختم ہو گیا اور مجھ میں دلیری

پیدا ہوگئی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اگر پکڑی نہ گئی تو جمعدار کو زہر پلا دوں گی پھر یہ زہر خود بھی پی لوں گی۔ میرے دماغ میں یہی بات آتی تھی کہ شیرے کو جمعدار نے دیکھ لیا ہوگا اور اُسے قتل کر دیا۔ پھر جب یہ پتہ چلا کہ شیرے کو گولی لگی ہے تو مجھے پکا یقین ہوگیا کہ اُسے میرے خاوند نے گولی ماری ہے۔ شام کو نمبردار اُسے بلانے آیا تو میں خوش ہوئی کہ اُسے پولیس گرفتار کر لے گی....

"وہ آیا تو میں نے اُسے بتایا کہ گاؤں میں پولیس اُتری ہوئی ہے اور آپ کو تھانیدار نے بلایا ہے.... اُس نے کہا کہ میں راستے میں سُن آیا ہوں کہ شیرا قتل ہوگیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس نے قتل ہونا ہی تھا۔ دوسروں کی عزّت کے ساتھ کھیلنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بدبخت نے کسی کی لڑکی کی عزّت پر ہاتھ ڈالا ہوگا....

"میں نے کوئی بات نہ کی۔ اُس نے بندوق اور دوسری چیزیں مجھے دیں اور کہنے لگا کہ میں پہلے تھانیدار کی بات سُن لوں۔ معلوم نہیں اُس نے کیوں بلایا ہے۔ وہ چلا گیا تو میں نے اُس کے تھیلے میں سے پرندے وغیرہ نکال کر دیکھا۔ میں پستول کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن پستول نظر نہ آیا۔ میں نے آپ سے کہا کہ شیرا اُس پستول کی گولی سے نہیں مر سکتا۔ کسی اور نے اُسے گولی ماری ہے، پھر میں نے سوچا کہ یہ افواہ ہے کہ شیرا گولی سے مرا ہے"۔

"وہ گولی سے مرا ہے رابی!" ـــ میں نے کہا۔

"پستول کی گولی سے؟"

"یہ معلوم نہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "اگر مجھے تمہارے خاوند کا ریوالور مل جاتا تو شاید پتہ چل جاتا کہ اس کی گولی سے مرا ہے یا کسی اور کی گولی سے"۔

محبّت ناپاک تھی؟

یہ ایک معمہ تھا۔ مقتول ریوالور لے کر گیا تھا اور گولی سے مارا گیا۔ وہ شکار کے علاقے سے دُور مارا گیا تھا۔ وہ اُس علاقے تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ میں نے خاصی مغز کھپائی کر کے حساب لگایا کہ وہ کس وقت گھر سے نکلا۔ پیدل چلتے، جائے واردات تک کتنے وقت میں پہنچا ہوگا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے موت کا وقت معلوم کیا۔ جائے واردات سے شکار گاہ تک ابھی تقریباً پانچ میل کا فاصلہ باقی تھا۔ میرے اندازِ حساب کے مطابق وہ شکار گاہ تک پہنچ ہی نہیں سکا تھا۔

ایک صورت یہ سامنے آتی تھی کہ مقتول کو رہزنوں نے روکا، مقتول نے ریوالور نکالا۔ رہزنوں نے اُس پر قابو پا لیا اور اسی ریوالور سے اُسے مار کر چلے گئے اور ریوالور ساتھ لے گئے۔

رابی نے اپنے جُرم کا اقبال کر لیا تھا۔ بات صاف ہوگئی کہ ریوالور جمعدار نہیں لے گیا تھا بلکہ رابی نے مقتول کو دیا تھا، اس کے باوجود میں جمعدار کو مُشتبہوں کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتا تھا اور میں نے رابی کو بھی مُشتبہ رکھنا تھا۔ اُس نے جو بیان دیا تھا وہ اُس کا اپنا بیان تھا۔ جس طرح اُس نے پہلے جھوٹ بولے تھے اسی طرح یہ بیان بھی یا اس کا کچھ حصّہ غلط ہو سکتا تھا۔ وہ جسے پاک محبّت کہتی تھی وہ ناپاک بھی ہو سکتی تھی۔ مختصر یہ کہ میں تفتیش اور حالات کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

میں سب کو تھانے لے گیا۔ میں نے جمعدار کو نہ بتایا کہ اُس کی بیوی نے یہ بیان دیا ہے۔ جمعدار نے مجھے کہا کہ میں اُس کو اور اُس کی بیوی کو بلاوجہ تنگ کر رہا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اطلاع دینا چاہتا ہے کہ اُسے مقتول کے رشتہ داروں سے مل کر پریشان اور بے عزّت

کیا جا رہا ہے۔

"جناب جمعدار صاحب!" ـــ میں نے اُسے کہا ـــ "میں جب آپ کو فارغ کر دوں گا تو آپ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو نہیں وائسرائے کو اطلاع دے دینا کہ بیوقوف سے ایک تھانیدار نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ آپ کو جمعدار وائسرائے نے بنایا ہے۔ اسی لئے جمعداروں، صوبیداروں اور صوبیدار میجروں کو وی سی او یعنی 'وائسرائے کمشنڈ آفیسر' کہتے ہیں لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ وائسرائے نے کمشن آپ کو دی اور قانون مجھے دے دیا اور مشکل در مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ وائسرائے کو آپ کی کمشن سے زیادہ اپنے قانون سے پیار ہے۔"

یہ تو ایک طرح کی جھک جھک تھی جو تھانے میں لگی ہی رہتی تھی اور ہم اپنے کام کرتے ہی رہتے تھے۔ میں آپ کو وہ باتیں سناتا ہوں جن میں آپ کی دلچسپی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جمعدار کا ریوالور میرے لئے معمہ بن گیا تھا۔ ریوالور جو لے گیا تھا وہ قتل ہو گیا تھا۔ میں اس معمے کا جواب جمعدار سے مانگ رہا تھا اور جمعدار غصے میں تڑپ تڑپ کر بے حال ہو رہا تھا۔ کبھی میرے ذہن میں یہ شک بھی اُٹھتا تھا کہ شیرے کو جمعدار اور راجی نے مل کر مارا ہے۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات آئی اور گزر گئی۔

صبح سویرے سویرے تھانے میں دو چارپائیاں آئیں۔ یہ دو زخمی تھے جو تھانے سے اڑھائی تین میل دُور ایک گاؤں سے لاتے گئے تھے۔ دونوں کو گولیاں لگی تھیں۔ ایک کی بائیں ران سے گولی گزر گئی تھی اور دوسرے کے کندھے سے گزری تھی۔ دونوں کا خون بہہ رہا تھا۔ زخموں پر کپڑے بندھے ہوئے تھے پھر بھی خون نکل رہا تھا۔ دونوں ہوش میں تھے۔

میں نے اپنے جونیئر سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ یہ کیس لے لے۔ وہ زخمیوں کو اٹھوا کر ہسپتال لے گیا اور اس دوران ان سے بیان بھی لیتا رہا۔ ہسپتال سے وہ بڑی تیزی سے آیا اور کاغذی کارروائی مکمل کر کے اُس نے میری گھوڑی لی اور تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر بہت تیزی سے چلا گیا۔ جاتے جاتے اُس

نے مجھے اتنا ہی کہا کہ ملزم پکڑنے ہیں۔

یہ اب اُس کا کیس تھا۔ میں دوسرے کیسوں میں مصروف تھا اور اُس وقت تو میرے دماغ پر شیرے کا قتل اور جمعدار کا ریوالور سوار تھا۔

یہ سب انسپکٹر رہتک کا رہنے والا ہندو رانگڑ تھا۔ جگن ناتھ اُس کا نام تھا۔ نیا نیا سب انسپکٹر بنا تھا۔ انگریز اپنے دورِ حکومت میں ہر ذات کے ہندو کو فوج میں بھرتی نہیں کرتے تھے۔ چند ایک علاقوں کے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ ان میں رہتک حصار کا علاقہ بھی شامل تھا۔ وہاں ہندوؤں کی دو تین ذاتیں تھیں جنہیں جنگجو (مارشل ریس) کہا جاتا اور فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ ان میں جگن ناتھ کی ذات بھی شامل تھی۔ چونکہ وہ جنگجو نسل سے تھا اس لئے اُس کی ذہنیت دوسرے ہندوؤں جیسی نہیں تھی۔ اپنی ڈیوٹی میں بڑا ہی سخت تھا۔ زندہ دل، ہنسنے ہنسانے والا، پینے پلانے والا بدمعاش لیکن دیانت دار۔

وہ دوسرے دن کے پچھلے پہر واپس آیا۔ ایک ملزم کو ہتھکڑی لگا کر ساتھ لایا تھا اور اُس کے ساتھ ایک لڑلہ گواہوں کا تھا۔ اس نے ۳۸ بور کا ایک ریوالور جس سے دو آدمیوں کو زخمی کیا گیا تھا، برآمد کیا تھا۔ وہ اُس نے میرے آگے رکھ دیا۔

"دھیان سے ملک صاحب!" ـــ اُس نے مجھے کہا ـــ "اس میں تین گولیاں فائر کی ہوئی ہیں اور تین باقی ہیں۔"

میں نے سیلنڈر کھول کر دیکھا۔ تین فائر کئے ہوئے راؤنڈ (کھوکھے) تھے اور تین راؤنڈ بغیر فائر کئے پڑے تھے۔ جگن ناتھ نے اس ریوالور کی برآمدگی کا مشیر نامہ میرے آگے رکھا تو میں نے اس پر ریوالور کا نمبر پڑھا۔ تصدیق کے لئے ریوالور پر نمبر پڑھا کہ غلط نہ لکھا گیا ہو۔ مجھے یہ نمبر جانا پہچانا سا لگا۔

جمعدار کے ریوالور کا لائسنس اور بُلیٹ اور اس میں جو گولیاں تھیں۔

سب میرے قبضے میں تھیں۔ میں نے لائسنس دیکھا۔ اس پر ریوالور کا وہی نمبر تھا۔ یہ ریوالور جمعدار کا تھا۔ میں نے جمعدار کو اندر بلایا اور اُس سے اُس کے ریوالور کا نمبر پوچھا جو اُسے زبانی یاد تھا۔ اُس نے نمبر بولا۔

"یہ دیکھیں" ـــ میں نے ریوالور اُس کے آگے کرتے ہوئے پوچھا ـــ "کیا یہی ہے آپ کا ریوالور؟ ..... دیکھنا اس میں لائیو راؤنڈ بھی ہیں"

اُس نے ریوالور ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے نمبر پڑھا۔

"یہی ہے" ـــ اُس نے کہا اور پوچھا ـــ "کہاں سے ملا ہے؟"

"آپ باہر بیٹھیں" ـــ میں نے ریوالور اُس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا ـــ "میں آپ کو بتاؤں گا۔"

میں نے سب انسپکٹر جگن ناتھ کو کیس کی پوری رپورٹ لینے کے لئے بٹھا لیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ علاقہ ایڈوانس ہوگیا ہے۔ لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کی بجائے اب ریوالور استعمال ہونے لگے ہیں۔

ایک پستول تین پگلے

یہ واردات جس میں دو آدمی ریوالور کی ایک ایک گولی سے زخمی ہوتے تھے، یوں ہوئی تھی کہ ان دونوں زخمیوں کو خاندانی دشمنی کی بنا پر ایک آدمی کے قتل کے جرم میں عمر قید ہوئی تھی۔ انہوں نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی تھی۔ کسی نکتے پر ہائیکورٹ نے دونوں کی عمر قید میں تخفیف کر دی اور سزا آٹھ سال رہ گئی۔ جیل کے قوانین کے مطابق انہیں معافی ملتی رہی۔ اُس طرح وہ ساڑھے چھ سال بعد رہا ہو کر آگئے۔

مقتول کے رشتہ داروں نے اب انتقام لینا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں خون کا بدلا خون تھا۔ رہا ہونے کے کچھ روز بعد یہ دونوں جو غالباً سگے بھائی یا چچازاد تھے (مجھے یاد نہیں رہا) صبح اپنے کھیتوں میں گئے۔ ایک کھیت میں

کوئی فصل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ والے کھیت میں اُونچی فصل تھی۔ دونوں آدمی خالی کھیت میں فصل والے کھیت کے قریب بیٹھ کر کے کھڑے تھے۔ پیچھے سے دو گولیاں فائر ہوئیں۔ ایک گولی ایک کی ران میں لگی اور ایک دوسرے کے کندھے میں۔

گولی کا زخم تو ہوتا ہی ہے اور درد بھی ہوتا ہے لیکن گولی کی دہشت بڑی ہوتی ہے۔ ان دونوں پر یہ دہشت طاری ہوتی۔ دونوں نے پیچھے دیکھا اور دونوں گر پڑے۔ انہیں تھانے لایا گیا۔ انہوں نے تھانے میں جب میں ان کے زخم دیکھ رہا تھا، مجھے ایک آدمی کا نام بتایا تھا، انہوں نے جب گولیاں کھا کر پیچھے دیکھا تھا تو انہیں فصل میں یہ آدمی بیٹھا ہوا دکھائی دیا تھا۔ وہ فصل میں غائب ہو گیا۔ انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ اُس آدمی کا چھوٹا بھائی تھا جسے ان دونوں نے قتل کیا تھا اور ساڑھے چھ سال بعد رہا ہو کر گھر آگئے تھے۔

جگن ناتھ نے اسی لئے بڑی تیزی سے کارروائی کی تھی کہ ملزم کو غائب ہو جانے سے پہلے پکڑ لے۔ ریوالور بھی برآمد کرنا تھا۔ اس نے ہسپتال جا کر دونوں زخمیوں کے بیان لئے اور واردات والے گاؤں جا پہنچا۔ ملزم گھر میں موجود تھا۔ اسے گرفتار کیا تو اُس نے کہا کہ اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟..... جگن ناتھ نے اُس کے گھر کی تلاشی لی۔ ریوالور برآمد نہ ہوا۔

دو گواہ مل گئے۔ ایک نے بتایا کہ اُس نے ملزم کو مینڈھ پر چلتے چلتے فصل کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ پھر دونوں آدمی آتے اور ان پر وہیں سے گولیاں چلیں جہاں ملزم فصل میں گیا تھا۔ دوسرے گواہ نے گولیاں چلنے کے بعد فصل میں سے دوسری طرف سے ملزم کو نکلتے دیکھا تھا۔ اُدھر بھی اُونچی فصلیں تھیں۔

جگن ناتھ نے عقل کا یہ کمال دکھایا کہ ملزم گولیاں چلا کر جس طرف بھی گیا وہ راستہ اور ٹھکانہ معلوم کر لیا اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ ملزم اپنے رہٹ پر چلا گیا تھا

جہاں سبزیوں کا باغ تھا۔ چونکہ ملزم موقعہ پر ہی پہچانا گیا تھا اس لئے شک نہیں تھا کہ ملزم کوئی اور تھا۔ جگن ناتھ نے اُسے کہا کہ وہ ریوالور دے دے لیکن وہ تو جرم سے ہی انکار کر رہا تھا۔

جگن ناتھ نے اُسے رات کو اپنے ساتھ چوپال میں رکھا۔ اُس نے جو کام تھانے میں آکر کرنا تھا وہ وہیں کر لیا۔ یہ پولیس کا دوسرا طریقہ ہے جو اُن بھُوتوں پر استعمال کیا جاتا ہے جو باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ جگن ناتھ کو اس طریقے کی خاص مہارت تھی۔ تین چار گھنٹوں کی "محنت" سے ملزم نے بتایا کہ اُس نے ریوالور اپنے رہٹ کے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

صبح جگن ناتھ اُسے رہٹ پر لے گیا۔ ساتھ نمبردار اور تین چار دیگر معزز افراد تھے۔ ان کے سامنے اُس نے ریوالور کی نشاندہی کی۔ کنواں زیادہ چوڑا تھا اس لئے پانی زیادہ تھا۔ غوطہ لگانے والوں کے لئے کنوئیں کی تہہ سے ریوالور نکالنا مشکل تھا۔ جگن ناتھ کے کہنے پر رہٹ کے آگے بیل جوتے گئے اور رہٹ چلایا گیا۔ اس کے ساتھ جگن ناتھ نے یہ انتظام کیا کہ گاؤں کے دو کنوؤں سے چرخیاں اکھاڑ کر رسے اور ڈول منگوائے۔ انہیں کھینچنے کے لئے بیل استعمال کئے۔

تین گھنٹوں بعد کنوئیں کا پانی کم ہو گیا تو دو آمیوں کو اتارا گیا۔ کنوئیں میں اتنا پانی رہ گیا تھا جو ان آدمیوں کی کمر تک آتا تھا۔ صرف رہٹ چلتا رہنے دیا گیا۔ ان آدمیوں نے ریوالور نکال لیا۔ ملزم سے جگن ناتھ نے گواہوں کے سامنے کہلوایا کہ یہی وہ ریوالور ہے جس سے اُس نے ان دونوں آدمیوں پر قتل کی نیّت سے گولیاں چلائی تھیں۔

اب آپ دیکھیں کہ جمعدار کا ریوالور اس کے پاس کس طرح آیا۔ اس سے جو اقبالی بیان لیا گیا اس میں اُس نے کہا کہ وہ اپنے ایک خالہ زاد بھائی کے ساتھ ایک گاؤں سے واپس اپنے گاؤں کو جا رہا تھا۔ اُس نے وہ جگہ بتاتی جہاں سے شیرے کی لاش ملی تھی۔ وہ شیرے کو نہیں جانتے تھے۔ ملزم نے بتایا کہ وہ اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ راستہ چھوٹا کرنے کے لئے عام راستے سے ہٹ گئے تھے اور آگے اُسی راستے پر ہو لئے جس کے قریب شیرے کی

لاش پڑی ہوتی تھی۔

ملزم نے وہاں ایک نوجوان لڑکے کو کھڑا دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں کالے رنگ کی کوتی چیز تھی جسے وہ دیکھ رہا تھا۔ ملزم کے خالہ زاد بھائی نے کہا کہ اس لڑکے کے ہاتھ میں ریوالور معلوم ہوتا ہے۔ ملزم نے کہا کہ لگتا ریوالور ہی ہے۔ وہ شیرے سے تقریباً تیس قدم دُور تھے۔ وہ چند قدم اور آگے آتے تو اس لڑکے (شیرے) نے انہیں دیکھا اور بڑی تیزی سے اُس کے ہاتھ میں جو چیز تھی وہ قمیص کے اندر لے گیا۔ ملزم کا خیال تھا کہ وہ اس چیز کو چھپا رہا ہے۔

وہ لڑکا جو چیز چھپا رہا تھا وہ اتنی تیزی سے قمیض کے اندر لے گیا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ ملزم اور اُس کا ساتھی اور آگے آگئے تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا کہ یہ ریوالور ہے۔ لڑکے نے جُھک کر اور جھپٹ کر ریوالور اُٹھایا اور ایک بار پھر قمیض کے اندر لے گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے نیفے میں اُڑس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک دھماکہ سُنائی دیا۔ لڑکے کی قمیض کے اندر سے ریوالور پھر گر پڑا پھر لڑکا گرا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا اور ساکن ہو گیا۔ ملزم نے بیان دیا کہ فوراً ہی اُس کے کپڑے خون میں رنگے گئے۔ ملزم نے ہر طرف دیکھا۔ وہاں کوتی اور آدمی نہیں تھا۔ اُس کے خالہ زاد بھائی نے کہا کہ کسی نے دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔ انہیں یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ لڑکے نے خودکُشی کی ہے یا اتفاقیہ گولی چل گئی ہے۔

ملزم نے بھی یہی خطرہ محسوس کیا وہ دونوں دوسری طرف مُڑ لے گئے تو ملزم کو ریوالور کا خیال آگیا۔ اُس نے خالہ زاد بھائی سے کہا کہ ریوالور اُٹھا لیں۔ اُس کے ذہن میں وہ دو آدمی آگئے جنہیں اب اُس نے زخمی کر دیا تھا۔ ان سے اُس نے اپنے بڑے بھائی کے خون کا حساب چکانا تھا۔ رابی اور شیرے کے بعد یہ تیسرا بیوقوف تھا جس نے یہ ریوالور اُٹھا لیا۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ اس

علاقے میں کسی نے اُسے شک میں پکڑ کر تلاشی لی اور اُس سے ریوالور بر آمد ہوگیا تو وہ قتل کے جُرم میں دھر لیا جائے گا۔

اُس نے ریوالور قمیض کے نیچے اپنے نیفے میں اُڑس لیا۔ اُس کے خالہ زاد بھائی کو ریوالور کے متعلق کچھ واقفیت تھی۔ ان دونوں نے شیرے کا ریوالور اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ تھے وہ دو آدمی جنہیں بھینسوں والے دو لڑکوں نے دُور راستے پر جاتے دیکھا تھا۔ انہوں نے ریوالور چھپائے رکھا اور گاؤں سے باہر جاکر سلنڈر کھولا۔ اس میں سے راؤنڈ اور رکھو کھے خود نکالنے پڑتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ ایک گولی فائر ہوچکی ہے اور پانچ گولیاں فائر ہونے والی ہیں۔

آخر ملزم اپنے دشمنوں کی گھات میں فصل میں جا بیٹھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ دونوں صبح اس خالی کھیت میں جایا کرتے ہیں۔ وہاں وہ کوئی کام کرا رہے تھے۔ ملزم کو بھی شیرے کی طرح یہ وہم تھا کہ جسے پستول کی ایک گولی لگتی ہے وہ مر جاتا ہے۔ اس نے دونوں پر ایک ایک گولی چلائی اور وہاں سے فصل میں چھپتا بھاگ گیا۔ اپنے رہٹ پر گیا اور ریوالور کنوئیں میں پھینک دیا۔

بڑا صاف اور آسان کیس تھا جو عدالت میں بھیجنے کے لئے تیار کرلیا گیا۔ میں رابی کو نہیں بچا سکتا تھا۔ ریوالور جمعدار کا تھا اور عدالت میں بتانا تھا کہ یہ ملزم کے پاس کس طرح گیا۔ یہ لمبا قصّہ ہے کہ مَیں نے مقدمہ کس طرح تیار کیا اور کیا کیا شہادت پیش کی۔ ملزم کو سات سال، اُس کے خالہ زاد بھائی کو اعانتِ جُرم میں دو سال سزائے قید ہوئی اور رابی کو ریوالور کی چوری کے جرم میں تین سال سزائے قید دی گئی۔ شیرے کی موت کے متعلق میرے محکمے نے لکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں مرا ہے۔ ریوالور اتفاقیہ ٹریگر دبنے سے فائر ہوگیا یا اُس نے خودکشی کی ہے۔

جب پیار نے کروٹ بدلی

وہ قصبہ دیہات نما تھا۔ اُس میں شہروں والی باتیں یہ تھیں کہ ایک ریلوے سٹیشن تھا۔ ڈاکخانہ اور تھانہ تھا اور سرکاری ہسپتال تھا۔ اس کے علاوہ ایک مڈل اور ایک ہائی سکول تھا۔ دو بازار تھے۔ دو پرائیویٹ ڈاکٹر بھی تھے۔ دیہات نما اس لئے تھا کہ اکثر لوگ جن میں مسلمان زیادہ تھے، کاشتکار تھے۔ قصبے کے ساتھ اور کچھ دُور اُن کے کھیت تھے۔ یہ کاشتکار دیہاتیوں کی طرح کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں دیہاتیوں جیسی اور لباس شہریوں جیسے تھے۔

صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے مجھے بیوی نے بڑی گہری نیند سے جگایا اور بتایا کہ تھانے سے کانسٹیبل آیا ہے۔ میں باہر نکلا۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ ایک آدمی کو لاتے ہیں بے ہوش ہے۔ کوئی زخم نظر نہیں آتا۔

میں اُنہی کپڑوں میں تھانے چلا گیا۔ برآمدے میں چارپائی رکھی تھی۔ اُس پر ایک جواں سال آدمی پڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شہری معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ وہ زندہ تھا۔ اُس کے جسم کا معائنہ اُلٹ پلٹ کر کیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے ڈنڈوں اور گھونسوں سے پیٹا گیا ہے۔ سر پر دو جگہ اُبھار تھا۔ خون کہیں سے بھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے اُسے فوراً سول ہسپتال بھیجا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو یہ کہہ کر ساتھ بھیجا کہ ڈاکٹر کو کہے کہ نزعی بیان لینا ہے۔

میں نے سب سے پہلے مضروب کی جامہ تلاشی لی تھی۔ اُس نے لٹھے کی قمیض پہنی ہوئی تھی جس کی ایک جیب اُوپر تھی اور ایک پہلو میں۔ دونوں جیبیں خالی تھیں۔ میں نے اُس کی اُنگلیاں بھی دیکھی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی کے

ساتھ والی اُنگلی پر صاف نشان دیکھا جو یہ شہادت دیتا تھا کہ اس اُنگلی میں لمبے عرصے سے انگوٹھی رہی ہے۔ یہ میں نے اس لئے دیکھا تھا کہ مجھے راہزنی کا شک تھا۔ راہزنی کا شک اس لئے ہُوا تھا کہ یہ شخص قصبے کی کسی گلی میں بیہوش پڑا نہیں پایا گیا تھا بلکہ یہ قصبے سے دو اڑھائی فرلانگ دُور کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی پر پڑا پایا گیا تھا۔ وہاں اسے زدوکوب کیا گیا جس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ کسی کے ساتھ دشمنی تھی اور دوسری وجہ راہزنی ہوسکتی تھی۔

مضروب کی شناخت ہوگئی تھی جو اس طرح ہوئی کہ دو آدمی ایک گاؤں سے شہر کی طرف آرہے تھے۔ اُنہوں نے مضروب کو راستے میں پڑا دیکھا۔ آج کل کوئی بھی اس طرح راستے میں بے ہوش پڑے ہوتے آدمی کو اُٹھا کر تھانے یا ہسپتال تک نہیں پہنچاتا۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ پولیس اُنہیں ہی دھر لے گی یا گواہ بننا پڑے گا اور معلوم نہیں کہ مضروب یا ملزموں کے متعلق پولیس کا رویہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ مقدمے دو دو تین تین سال چلتے ہیں۔ عدالت میں گواہی دینے کے لئے بلا لیتے ہیں لیکن کوئی گواہی نہیں ہوتی۔ تاریخوں پہ تاریخیں ملتی چلی جاتی ہیں۔ اُن وقتوں میں لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ ہوتا تھا۔ قانون اور پولیس کی مشینری صحیح ہاتھوں پہ چلتی تھی۔ کسی بے گناہ کے پھنس جانے کا احتمال بہت ہی کم ہوتا تھا۔ لوگوں میں ہمدردی یہ ہوتی تھی کہ یہ شخص زندہ ہے اور اگر اسے فوراً ہسپتال پہنچا دیا جائے تو بچ رہے گا۔

چاندنی رات تھی۔ ان دو آدمیوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گندم کی فصل کھلیانوں میں پہنچ گئی تھی اور ہر کھلیان کی چوکیداری کے لئے ایک ایک آدمی وہاں سویا ہُوا تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے ایک کھلیان میں جا کر وہاں سوتے ہُوئے ایک آدمی کو جگایا اور اُسے بتایا کہ ایک آدمی راستے میں بے ہوش پڑا ہے جو شہری معلوم ہوتا ہے۔ اس آدمی نے ساتھ والے کھلیان میں سوتے ہُوتے آدمی کو جگایا۔ انہوں نے چارپائی اُٹھائی اور مضروب تک پہنچے۔ چاندنی

تو بھی پھر بھی انہوں نے ماچس جلا کر دیکھا۔ کھلیان والے آدمیوں نے اُسے پہچان لیا۔ اُس کا نام ابوذر تھا۔ وہ اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ اُس کے خاندان کی زمینداری تھی۔

مضروب کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی بجائے ان چاروں آدمیوں نے اُسے چارپائی پر ڈالا اور تھانے لے آتے۔

جو آدمی مضروب کو اُٹھا کر لاتے تھے اُن پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ واردات اُنہوں نے کی ہوتی تو وہ تھانے نہ آتے۔ میں نے ان دو آدمیوں کو یہ کہا کہ میں کاغذی کارروائی مکمل کرلوں وہ ذرا تھانے میں موجود رہیں۔ کھلیان والے دو آدمیوں میں سے ایک کو کہا کہ وہ مضروب کے گھر جا کر اطلاع دے۔ کھلیان والے دوسرے آدمی کو میں نے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے پاس بٹھا لیا۔ مضروب کے کھیت اس آدمی کے کھیتوں کے قریب تھے۔ یہ آدمی کسان تھا اور کسی کی زمین پر یہ بٹائی پر کاشتکاری کرتا تھا۔

"ابوذر کو تم اچھی طرح جانتے ہو؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "ایک تو وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے کھیت ہمارے کھیتوں کے ساتھ ہیں"۔

"کیا یہ رات اپنے کھلیان میں سویا تھا؟"

"نہیں جناب!" — اس نے جواب دیا — "اسے کھلیان میں سونے کی کیا پڑی ہے۔ اس نے زمینیں بٹائی پہ دے رکھی ہیں"۔

"کیسا آدمی ہے؟"

"شوقین مزاج آدمی ہے" — اُس نے جواب دیا — "میں اور تو کچھ نہیں جانتا"۔

"اس کی یا اس کے خاندان کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی؟"

"کبھی سُنا نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ہم تو مزارعے ہیں جناب! الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی اپنی دُنیا ہے۔ اندر کی باتیں ہم نہیں جانتے"۔

"تم نے کہا ہے کہ ابوذر شوقین مزاج آدمی ہے" — میں نے کہا — "کیا شوقینی کرتا ہے؟"

"شوقینی یہی ہوتی ہے جناب، کہ اچھے کپڑے پہن کر نکلتا ہے" — اُس نے جواب دیا — "کوئی خوبصورت عورت گزرے تو اُسے دیکھتا ہے۔ اگر وہ عورت جان پہچان کی ہو تو اُسے روک کر باتیں کرتا ہے۔ رہن سہن بھی امیروں جیسا ہے..... ہم غریب لوگ اسی کو شوقینی کہتے ہیں۔"

میں اس خیال سے اس آدمی سے مضروب کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ اس کی کسی کے ساتھ عداوت ہوگی لیکن یہ آدمی مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا۔ ہسپتال سے رپورٹ آنے تک میں گھر گیا۔ وردی پہن کر جلدی جلدی ناشتہ کیا اور تھانے آکر ان آدمیوں کو ساتھ لے کر اُس جگہ چلا گیا جہاں مضروب پڑا پایا گیا تھا۔

سونے کی انگوٹھی

وہ چونکہ پگڈنڈی تھی، دیہاتی علاقے کے لوگ اس پگڈنڈی سے شہر آتے تھے۔ یہ پگڈنڈی سورج نکلنے سے پہلے ہی استعمال ہونی شروع ہوگئی تھی یعنی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اس لئے وہاں ملزم یا ملزموں کے کھُروں کی اُمید رکھنا بے کار تھا۔ وہاں سے تو مویشیوں کے ریوڑ بھی گزر گئے تھے۔ جو جگہ مجھے دکھائی گئی وہاں پگڈنڈی کے دونوں طرف چھُپ کر بیٹھنے کی موزوں جگہ تھی۔ وہاں سے پگڈنڈی مُڑتی تھی اور پگڈنڈی کے دونوں طرف کنارے اُونچے تھے۔ ان کے پیچھے کھیت تھے جو کچھ گہرائی میں تھے۔ مَیں نے دونوں طرف دیکھا۔ ایک طرف پاؤں کے نشان تھے لیکن وہ اس طرح ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے تھے کہ کوئی کھُرا الگ کر کے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ میں نے پگڈنڈی کے اُس کنارے کو ہر طرف سے بہت غور سے دیکھا۔ ایسے نشان ملتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے آدمی اُوپر ہو کر نیچے اُترے

ہیں۔ کھوجی کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں مضروب کے نزعی بیان کی امید لگائے ہوئے تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ بیان دینے کے لئے ہوش میں آتا ہے یا بیہوشی میں ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ موقعۂ واردات پر میرے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ہسپتال جانے کے لئے وہاں سے چل پڑا۔ ایک کانسٹیبل جو مضروب کے ساتھ جانے والے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ گیا تھا مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اُس نے بڑی اچھی خبر سنائی کہ مضروب ہوش میں آگیا ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ خطرے سے باہر ہے۔

میں ہسپتال چلا گیا اور مضروب کو اچھی حالت میں پایا۔

"بیان دے سکتے ہو ابوذر؟" — مَیں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا۔

اُسے دُودھ پلایا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں بھی دی تھیں۔ میں اُس کے پاس بیٹھ کر بیان لینے لگا۔

اُس نے ایک گاؤں کا نام بتا کر کہا — "وہاں کے ایک آدمی سے کچھ رقم لینی تھی۔ ایک دو اور کام بھی تھے۔ ان میں بہت دیر ہو گئی۔ دو دوستوں نے روک لیا۔ اُن کے پاس بیٹھے اور زیادہ دیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ گیارہ بج گئے ہوں گے۔ میں دوستوں کی ضد کے باوجود کہ رات وہیں گزاروں، واپس چل پڑا۔ ڈیڑھ میل کل فاصلہ ہے۔ شہر سے تھوڑی ہی دُور رہ گیا تھا تو اچانک تین آدمی چھُپے ہوئے اُٹھے۔ دو میرے آگے ایک پیچھے تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ میرے سر پر کُلّے پر بندھی ہوئی پگڑی تھی۔ سامنے والے آدمیوں نے ایک ایک مُکّہ مجھے پیٹ میں مارا۔ میں دوہرا ہو گیا اور میرے سَر سے پگڑی گر پڑی۔ مَیں ایک طرف کو مُڑا تو میرے سَر پر لاٹھی کی ضرب پڑی۔ اس کے فوراً بعد مجھے غشی آگئی اور اب تھوڑی دیر پہلے ہوش آئی تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پڑا دیکھا۔"

"کیا تمہاری کسی اُنگلی میں انگوٹھی تھی؟"

"ہاں جی!"— اُس نے بایاں ہاتھ اُلٹا کر کے اپنے سامنے کیا اور کہنے لگا —"اب نہیں ہے .... انگوٹھی سونے کی تھی .... میں دیکھ چکا ہوں کہ میرے پہلو کی جیب میں اڑھائی سو روپیہ تھا جو اب نہیں ہے۔ یہ انہوں نے ہی نکالا ہو گا جنہوں نے مجھے مارا ہے۔"

"کیا تم نے کسی کو پہچانا نہیں؟"

"چہرے دیکھنے کی تو مجھے مہلت ہی نہیں ملی"— اُس نے جواب دیا — "حالانکہ چاندنی بڑی صاف تھی۔"

"مارنے سے پہلے اُنہوں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ نکال دو؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا۔

"کسی کے ساتھ دشمنی؟"

"نہ جی!"— اُس نے وثوق سے جواب دیا — "ایسی خونی دشمنی تو کسی کے بھی ساتھ نہیں۔"

مجھے خیال آیا کہ یہ شخص اُس گاؤں میں رقم لینے کے لئے گیا تھا۔ رقم اڑھائی سو روپے تھی جو آج بالکل معمولی لگتی ہے، لیکن اُس وقت اڑھائی سو آج کے چار ہزار روپوں کے برابر تھے۔ مجھے شک ہوا کہ اُس نے رقم لی اور کسی جرائم پیشہ آدمی نے دیکھ لی۔ وہ پہلے ہی آ کر یہاں چھُپ گئے اور راستے بیہوش کر کے پھینکا اور رقم کے ساتھ سونے کی انگوٹھی بھی لے گئے۔ میں اِس شک کی بنا پر اُس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ مَیں نے جب اُس سے تین چار سوال پوچھے تو وہ میرے شک کو سمجھ گیا۔

"آپ کا شک درست ہو سکتا ہے"— اُس نے کہا — "لیکن مجھے لُوٹنے والے کوئی اور نہیں ہو سکتے۔ وہ یہی لوگ ہوں گے جن سے میں رقم لایا تھا۔ یہ میرے مزارعے ہیں۔ میرے نوکر نہیں۔ مَیں نے اپنی آدھی زمین انہیں بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ باقی آدھی مزارعوں کے ایک اور خاندان کے پاس ہے۔ یہ ایک اور گاؤں کے رہنے والے ہیں اور شریف لوگ ہیں۔ دوسرے مزارعے

جن سے میں رقم لایا تھا ذرا اُستاد قسم کے لوگ ہیں۔"

"کیا اُنہوں نے یہ رقم تم سے اُدھار لی تھی؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا — "دو سال گزرے انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر مونگ اور ماش باہر باہر ہی بیچ ڈالی اور پیسے مجھے دینے کی بجائے اپنی ایک بیٹی کی شادی پر خرچ کر دیئے۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ اسی مقصد کے لئے انہوں نے یہ فصل بیچی تھی اور رقم قرض کے طور پر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس سے اگلے سال انہوں نے فصل پر مجھے قرض میں سے کچھ بھی واپس نہ کیا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ لوگ رقم دبا جائیں گے۔ میں تین مہینوں سے ان کے پیچھے پڑا ہُوا تھا کہ رقم واپس کریں۔ یہ ٹال رہے تھے۔ میں نے آخر انہیں دھمکی دی کہ ان سے زمین واپس لے کر دوسرے خاندان کو بٹائی پر دے دوں گا۔"

"تم نے انہیں گالی گلوچ بھی کی ہو گی؟"

"وہ تو کرنی ہی تھی جناب!"— اُس نے کہا — "ورنہ رقم پھنسی رہتی۔ گالی گلوچ تو بہت کرنی پڑی .... مجھے انہی کے ایک رشتہ دار نے پرسوں بتایا تھا کہ اِن کے پاس پیسے آ گئے ہیں۔ میں دن کے وقت نہ جا سکا۔ ایک کام میں ایسا پھنسا کہ شام ہو گئی۔ میں شام کو ہی چلا گیا۔ سیدھا اُن کے گھر گیا اور کہا کہ میں آج ساری رقم لے کر ہی جاؤں گا۔ وہ کبھی میرے آگے ہاتھ جوڑتے، کبھی کوئی بہانہ پیش کر دیتے لیکن میں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا ....

"آخر وہ رقم دینے پر آ گئے لیکن حساب میں گڑبڑ کر رہے تھے۔ ان کا ایک جوان بیٹا ہے جو اپنے آپ کو بدمعاش سمجھتا ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ جوا کھیلتا ہے اور چرس وغیرہ بھی پیتا ہے۔ جب رقم کا حساب ہو رہا تھا تو وہ میرے ساتھ بڑے رُعب سے بات کرتا تھا۔"

"اُس کے ساتھ تمہارا لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟"

"ہاں جی!"— ابوذر نے جواب دیا — "اُس کے ساتھ تو بہت جھک

جھک ہوئی تھی اور جب فیصلہ ہو گیا کہ اتنی رقم بنتی ہے تو اُس نے کہا تھا کہ یہ رقم ہضم نہیں کر سکو گے۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا تھا۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ میں اِن سے زیادہ رقم لے رہا ہوں حالانکہ میں نے پچپن روپے چھوڑ دیتے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے دو سَو چوالیس روپوں پر راضی ہوتے اور یہ رقم مجھے دے دی۔"

اُس کی ان باتوں سے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسے انہی لوگوں نے لُوٹا ہے۔ اس کے پیشِ نظر میں نے اُس سے کئی اور سوال پوچھے۔ اُس کے جوابوں سے یہ صورت سامنے آئی کہ اس نے اُنہیں ڈرا دھمکا کر اور گالی گلوچ کر کے یہ رقم لی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اُن سے رقم زیادہ لے لی گئی ہے۔ وہ شریف اور سیدھے سادے لوگ نہیں تھے اور اُن کا ایک جوان آدمی بدمعاش بھی تھا۔ تین آدمی اور بھی تھے۔ دونوں اس بدمعاش کے بھائی تھے اور تیسرا ان کا باپ تھا۔

ابوذر ابھی چل پھر نہیں سکتا تھا اس لئے میں اُسے اپنے ساتھ نہ لے جا سکا۔ میرے لئے فوری طور پر اس گاؤں جانا ضروری تھا جہاں سے ابوذر رقم لایا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے ان آدمیوں کو فارغ کرنا ضروری سمجھا جو ابوذر کو بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا لاتے تھے۔ ان چاروں کو بلا کر ابوذر کے سامنے کھڑا کیا۔ دو کو اُس نے پہچان لیا۔ وہ اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ دوسرے دو اُس کے لئے اجنبی تھے۔ میرے پوچھنے پر ابوذر نے بتایا کہ ان میں سے کسی پر اُسے شک نہیں نہ ہی کسی کے ساتھ عداوت یا لین دین ہے۔

میں نے ان چاروں کے نام پتے وغیرہ لکھ کر انہیں کہا کہ عدالت میں گواہی کے لئے پیش ہونا پڑے گا۔ پھر ان کا شکریہ ادا کر کے انہیں فارغ کر دیا۔

مزارعوں کی خوبصورت عورت

میں اُس گاؤں میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ داخل ہوا تو گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ نمبردار کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا۔ میں نے اُسے ابوذر کے مزارعوں کے گھر تک لے چلنے کو کہا۔ وہ مجھے وہاں لے گیا۔

دیہات کے گھروں کے دروازے کھُلے رہتے ہیں۔ میں مزارعوں کے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر میں دو آدمی اور تین عورتیں تھیں۔ دو تین بچے بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ پولیس کو دیکھ کر بہت گھبراتے۔ ان آدمیوں میں ایک بوڑھا تھا۔ میں نے اُس سے اُس بیٹے کے متعلق پوچھا جو ابوذر نے بتایا تھا کہ بدمعاش ہے۔ میں نے بوڑھے کو سنبھلنے اور سوچنے کی مہلت نہ دی۔

"بالکل صحیح بتانا" ——— میں نے کہا اور ایک تیر چلایا ——— "وہ رات کو باہر نکلا تھا؟"

"تھوڑی دیر پہلے آگیا تھا حضور!" ——— بوڑھے نے کہا ——— "پھر کہیں نکل گیا ہے" ——— اُس نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا ——— "اُس نے کیا کیا ہے حضور؟"

"وہ رات کو واپس نہیں آیا تھا؟" ——— میں نے اُس کے سوال کا جواب نہ دیا۔

"ہاں حضور!" ——— اُس نے کہا ——— "وہ رات کو واپس نہیں آیا تھا۔"

"کہاں رہا رات بھر؟" ——— میں نے پوچھا ——— "تم نے پوچھا تھا؟"

"نہیں حضور!" ——— بوڑھے نے جواب دیا ——— "پوچھو تو خفا ہوتا ہے۔"

میں نے نمبردار سے کہا کہ اُسے ڈھونڈ کر لے آؤ۔ اُس کا نام داؤد تھا۔

اس مکان کے دو کمرے تھے اور یہ کچا مکان تھا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر خانہ تلاشی شروع کر دی۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ضروری بات سُنا دیتا ہوں۔ دیہات میں لوگ کمرے کے کونے

ہیں مٹی کے برتن اس طرح رکھتے ہیں کہ مٹی کی نئی ہانڈی کے اُوپر ہانڈی یا ڈولی رکھی ہو گی۔ اس کے اوپر پھر ہانڈی یا ڈولی اور اس طرح چار، پانچ ہانڈیاں اور ڈولیاں اور ایک دو دیگچیاں ایک دوسری کے اُوپر رکھی ہوتی ہیں۔ کسی میں گڑ ہوتا ہے کسی میں شکر کسی میں دال وغیرہ اور ان میں سے کسی میں پیسے بھی رکھے ہوتے ہیں۔

اس گھر میں بھی ہانڈیاں ڈولیاں ایک کمرے کے کونے میں اُوپر نیچے رکھی تھیں۔ میں نے انہیں ہٹا ہٹا کر دیکھا۔ سب سے نیچے والی ڈولی میں پانچ پانچ کے نوٹ اور ایک ایک روپے کے سکّے کپڑے کی ایک گتھی میں رکھے ہوئے برآمد ہوئے۔ میں نے رقم گنی۔ دو سَو دس یا دو سو پندرہ روپے تھے۔ وہ اتنے امیر لوگ نہیں تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم شک پیدا کرتی تھی۔ وہ گذشتہ رات دو سَو چالیس روپے ابوذر کو دے چکے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ یہ وہی رقم ہے جو انھوں نے ابوذر کو دی تھی اور وہ رقم واپس آگئی ہے۔

گھر میں جو دوسرا آدمی تھا وہ اس بوڑھے کا بڑا بیٹا تھا۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ اُس نے مجھے اچھی طرح سمجھایا کہ کتنی رقم کہاں سے اور کتنی کہاں سے آئی ہے۔ لیکن میں نہیں مان رہا تھا۔ میں کہتا تھا کہ یہ رقم ابوذر کی جیب سے نکالی گئی اور میں انہیں یہ بھی کہتا تھا کہ رقم پوری کردو اور انگوٹھی بھی دو۔

میں نے اُس کے بڑے بیٹے کو بھی اپنے سامنے کھڑا کر لیا تھا۔ باپ بیٹا قسمیں کھاتے اور کہتے تھے کہ وہ مجھے شہادت مہیا کر دیں گے کہ یہ رقم کہاں کہاں سے آئی تھی۔

"ابھی وقت ہے" — میں نے کہا — "پوری رقم اور انگوٹھی دے دو گے تو میں چلا جاؤں گا۔ کسی کو گرفتار نہیں کروں گا۔ نہیں مانو گے تو تمہاری عورتوں کو بھی تھانے لے جاؤں گا۔"

داؤد ابھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد نمبردار آیا اور مجھے الگ کر کے بتایا کہ داؤد گاؤں میں ہی تھا۔ اُس نے جب شور سُنا کہ پولیس آئی ہے تو وہ گاؤں سے کھسک گیا۔ نمبردار کو یہ اطلاع ایک آدمی نے دی تھی۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ داؤد کیسا آدمی ہے۔ نمبردار نے اُس کے متعلق کوئی اچھی رپورٹ نہ دی بلکہ کچھ ایسی باتیں بتائیں جن سے میرا یہ شک مزید پختہ ہو گیا کہ داؤد نے ضروری ہاتھ مارا ہے۔

میں نے گھر کے تمام افراد کو جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، تھانیداروں کے رعب سے کہا کہ سب تھانے چلو۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ فوراً میرے آگے آگے نہیں چل پڑے ہوں گے۔ بوڑھا اور اُس کی بیوی میری منتیں کرنے لگے۔ دوسری دو عورتیں اتنا ڈریں کہ ایک کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے اور زیادہ رُعب گانٹھا۔ نمبردار بھی انہیں کہہ رہا تھا کہ وہ تھانے چلے جائیں لیکن وہاں تو باقاعدہ ماتم کی فضا بن گئی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے کہا کہ انہیں باہر نکالو۔

میرے آدمیوں نے سب کو ہانکنا شروع کر دیا۔ میں دراصل ابھی انہیں تھانے نہیں لے جا رہا تھا۔ ابھی انہیں چوپال میں بٹھانا اور ہر ایک سے الگ الگ پوچھ گچھ کرنی تھی۔

میں صحن میں کھڑا تھا۔ اس گھر کی ایک جوان عورت میرے پاس آئی۔ وہ میرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ اس عورت کی عمر چھبیس ستائیس سال ہو گی۔ بڑے دلکش جسم کی عورت تھی۔ نقش و نگار بھی اچھے اور رنگ بھی صاف تھا۔ میں اُسے صحن میں ہی ذرا پرے لے گیا تھا۔ اُس نے جب میرے ساتھ بات کی تو میں نے دیکھا کہ یہ بڑی دلیر عورت ہے اور ڈرنے والی نہیں۔ بات بڑے پکے طریقے سے کرتی تھی۔

"داؤد نے اگر کچھ کیا ہے تو میں اُس کی قسم نہیں کھاتی" — اُس نے کہا — "میری اس بات پر غور کریں .... یہ شخص ابوذر ہم سے بدلہ لے رہا ہے۔ اُس نے آپ کو ہمارے پیچھے ڈال دیا ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے ابوذر پر کیا بیتی ہے؟

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا — "یہ خبر گاؤں میں پہنچ چکی ہے کہ

رات کو کسی نے راستے میں اُسے مارا ہے اور وہ اب ہسپتال میں ہے۔"

"اب بات کرو" ـــــ میں نے کہا۔

"بات یہ ہے جی!" ـــــ اُس نے بتایا ـــــ "دو تین مہینوں سے ابوذر بُری نیت سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ کھیتوں میں اتنا زیادہ نہیں آتا تھا لیکن اُس نے میرے پیچھے کھیتوں میں آنا شروع کر دیا۔ میں اُس کی نیت کو سمجھ گئی تھی۔ ہم لوگ اُس کے مقابلے میں غریب ہیں اور اُسی کے کھیتوں سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی عزت اُس کے حوالے کر دیں۔ میں نے اپنے خاوند کو بتا دیا تھا اور بتایا اس لئے تھا کہ میرے خاوند کو کوئی اور ہی شک نہ ہو جائے۔ خاوند نے مجھے کہا کہ اسے ٹالنے کی کوشش کرو۔ اگر کبھی دست درازی کرے تو بتانا....

"سات آٹھ روز گزرے اس نے دست درازی بھی کر دی۔ میں نے اُسے کہا کہ پھر کبھی اُس نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو میں اپنے خاوند اور اُس کے بھائیوں کو بتا دوں گی۔ یہ کہنے لگا کہ تم نے میری بات نہ مانی تو میں نے تم سے جو رقم لینی ہے وہ دوسرے ہاتھوں وصول کر لوں گا اور اگر تم مان جاؤ تو میں تم لوگوں کو آدھی رقم چھوڑ دوں گا.... میں نے اُسے کہا کہ خزانہ میرے قدموں میں رکھ دو تو بھی میں تمہاری بات پر نہیں آؤں گی۔ اُس نے مجھ پر بہت رعب جھاڑا اور یہ بھی کہا کہ میں تم سے اپنی زمین واپس لے لوں گا....

"میں اسے وہیں چھوڑ کر آ گئی۔ میں نے اسے بہت بُری باتیں کہی تھیں۔ میں نے خاوند کو بتایا کہ آج یہ بات ہوئی ہے۔ ابوذر ابھی کھیتوں میں ہی گھوم پھر رہا تھا۔ میرے خاوند نے اسے جا پکڑا۔ میں بہت ڈری کہ لڑائی جھگڑا ہو گا تو پولیس ہم غریبوں کو ہی پکڑے گی لیکن لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ کچھ بدکلامی ضرور ہوئی۔ ابوذر نے میرے خاوند کو بھی وہی دھمکیاں دیں جو وہ مجھے دے چکا تھا۔ ایک یہ کہ اپنی رقم فوراً واپس لوں گا اور دوسری یہ کہ اپنی زمینیں واپس لے کر کسی اور کو بٹائی پر دے دوں گا۔ میرے خاوند نے اُس کی بہت بے عزتی کی....

"اگلے ہی روز ابوذر نے رقم مانگ لی۔ میرے خاوند اور سُسر نے جب

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "یہ صرف میرے خاوند کو معلوم ہے.... داؤد اُسی وقت رات کو گھر سے نکل گیا تھا جب ابوذر ابھی ہمارے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔"

میں اس دیہاتی عورت کے ساتھ زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا شک یہ تھا کہ داؤد پہلے گھر سے نکل گیا تھا اور دو آدمیوں کو ساتھ لے کر ابوذر کے راستے میں جا بیٹھا پھر اُس نے واردات کی۔ اب اس عورت کی بات سُن کر میرے شک میں یہ اضافہ ہو گیا کہ داؤد کو معلوم تھا کہ ابوذر نے اس کی بھابی پر دست درازی کی ہے۔ لہٰذا اُس نے اس بے عزتی کا انتقام لیا۔ یہ دیہاتی عورت سادگی میں بتا بیٹھی کہ اس کے ساتھ ابوذر نے یہ سلوک کیا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ میرے شک کو مزید پختہ کر رہی ہے۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس عورت کے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو میرے پاس بھیجے۔

اُس کا خاوند میرے پاس آیا تو میں نے اُس سے اس واقعہ کے متعلق پوچھا لیکن اُسے کوئی اشارہ نہ دیا کہ ابوذر کا اس کی بیوی کے ساتھ کیا تعلق تھا۔ خاوند نے بالکل وہی بات سُنا دی جو اُس کی بیوی سُنا چکی تھی۔

"حضور!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اگر میرے یہ دو معصوم بچے نہ ہوتے تو میں اس شخص کو سارے گاؤں کے سامنے قتل کر کے تھانے چلا جاتا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ غریبوں کی عزت ہی نہیں ہوتی۔ اُس نے ہم سے رقم مانگی۔ ہم نے اپنے آپ کو مجبوری اور مشکل میں ڈال کر اُسے رقم دے دی۔ اب ہم اُس کی زمینیں چھوڑ دیں گے۔ باقی جو رقم آپ نے برآمد کی ہے یہ ہم نے آپ کو بتا دیا ہے کہاں سے آئی ہے۔ آپ حاکم ہیں ہم چور نہیں کہ اُس کے پیچھے جا کر اُسے مارتے اور رقم اُس کی جیب سے نکال لیتے۔"

"داؤد کے متعلق کیا کہتے ہو؟"

"ہمارے اس بھائی نے ہمیں بہت خراب کیا ہوا ہے" ـــــ اُس نے

جواب دیا — "نکما اور نکھٹو ہوگیا ہے۔ تکیے پر وقت گزارتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ چرس پیتا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا سارا خاندان بدنام ہوگیا ہے، لیکن میں آپ کو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اتنی ہمت والا نہیں کہ وہ اتنی اونچی ذات کے آدمی پر اس طرح حملہ کرے اور اُسے لُوٹ لے۔"

نشے میں ایسا بیہوش ہُوا

یہ تو اب میں نے دیکھنا تھا کہ وہ اتنی ہمت والا تھا یا نہیں۔ میں نے اس گھر کی عورتوں کو تو نہ چھیڑا، ان کے آدمیوں کو اپنے ساتھ چوپال میں لے گیا۔ ان کا ایک بھائی اور بھی تھا۔ وہ بھی آگیا۔ میں نے نمبردار کو اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے اس خاندان کے ہر فرد کے متعلق رائے لی۔ نمبردار نے چالاک بننے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ ابوذر کی حمایت میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے وہیں روک دیا۔

"تم نے ان غریبوں کو دھمکیاں دے دے کر ان سے ابوذر کو زیادہ رقم دلائی ہے"— میں نے کہا — "اور تم نے ابوذر کو بدمعاشی میں مدد دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہاری ذات اور قبیلے کا آدمی ہے۔ کیا تم مجھے گمراہ کرسکو گے؟ میں تمہیں ان کے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ صحیح بات کرو ورنہ نمبرداری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

اس طرح کچھ اور ڈانٹ ڈپٹ کرکے میں نے نمبردار کا دماغ درست کر دیا۔ اُس نے جو صحیح رپورٹ مجھے دی وہ یہ تھی کہ ابوذر اس عورت کو پھانسنا چاہتا تھا۔ ابوذر کے ساتھ اس کا دوستانہ تھا۔ اس کے متعلق نمبردار نے بتایا کہ عورتوں کا شکاری ہے۔ داؤد کے متعلق اُس نے وہی رائے دی جو داؤد کا بھائی دے چکا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ داؤد نے کبھی کوئی واردات نہیں کی۔ لڑنے جھگڑنے والا آدمی بھی نہیں۔

نمبردار کے ساتھ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مجھے اطلاع ملی داؤد آگیا ہے۔ میں نے اُسے اُسی وقت بُلا لیا اور نمبردار کو باہر بھیج دیا۔

"رات کہاں گزاری ہے؟"— میں نے اُس سے پوچھا۔

"تکیے پر"— اُس نے جواب دیا۔

"ساری رات وہاں کیا کرتے رہے ہو؟"

"شغل میلہ کرتے رہے حضور!"— اُس نے جواب دیا — "وہیں آنکھ لگ گئی اور صبح ہوگئی۔"

"اب سیدھی بات کرو داؤد!"— میں نے اُسے کہا — "باقی رقم کہاں ہے؟ جُوئے میں ہار دی ہے؟"

"میں نے کوئی رقم نہیں ہاری"— اُس نے جواب دیا اور پوچھا — "آپ کون سی رقم کی بات کر رہے ہیں؟"

"جو تم نے ابوذر کی جیب سے نکالی ہے"— میں نے کہا۔

"نہیں جناب!"— اُس نے کہا — "میں نے کسی کی جیب سے رقم نہیں نکالی۔ ابوذر ابھی ہمارے گھر میں بیٹھا ہُوا تھا جب میں باہر چلا گیا تھا۔"

اُس کے ساتھ جو مکالمہ بازی ہوتی وہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ فوراً مان جاتا۔ یہ تو مجھے تکیے سے معلوم کرنا تھا کہ وہ کس وقت تکیے میں آیا اور کس وقت وہاں سے آیا اور کیا اُس کے پاس ہارنے کے لئے رقم تھی یا نہیں۔ میں نے اس سے پوچھ لیا کہ وہاں اور کون کون تھا۔ اُس نے تین یا شاید چار آدمیوں کے نام بتائے تھے۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ ان سب آدمیوں کو بلاتے۔

ان میں سے دو جلدی آگئے۔ یہ دونوں تکیے کے ملنگ تھے۔ میں نے باری باری ان سے پوچھ گچھ کی۔ اس سے مجھے یہ معلوم ہُوا کہ داؤد رات کے پہلے پہر تکیے پر گیا تھا۔ پھر دو تین آدمی اور آگئے تھے۔ انہوں نے بازی بھی لگائی تھی۔ داؤد کے پاس تین یا چار روپے تھے۔ اُس نے دو یا تین روپے ہار دیئے تھے۔

پھر یہ نہیں کھیلا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے چرس معمول سے زیادہ پی لی تھی اور ایک طرف ہو کر لیٹ گیا تھا۔

"گھنٹے دو گھنٹے کے لئے باہر گیا ہو گا" — میں نے کہا۔

"نہیں سرکار!" — دونوں ملنگوں کا یہی جواب تھا — "اس سے تو پاؤں پر کھڑا نہیں ہُوا جاتا تھا۔ یہ نشے میں ایسا بے ہوش ہُوا کہ صبح سورج نکل آنے کے بعد اس کی آنکھ کُھلی۔

میں نے ان دونوں سے پوچھا تھا کہ داؤد نے ابوذر کے متعلق کوئی بات کی تھی۔ دونوں نے مجھے بتایا کہ صرف بات ہی نہیں کی تھی بلکہ اسے گالیاں دیتا تھا۔

"گالیاں کیوں دیتا تھا؟"

"کہتا تھا کہ وہ دھونس جما کر رقم زیادہ لے گیا ہے" — ملنگوں نے مجھے بتایا — "وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ہم اس کی زمینیں تو چھوڑ دیں گے لیکن میں اس شخص کو نہیں چھوڑوں گا۔ جہاں موقعہ ملا بدلہ لوں گا۔"

ان دونوں ملنگوں سے میں نے بہت دیر تک پوچھ گچھ کی تھی۔ اتنے میں تین اور آدمی آ گئے تھے۔ میں نے انہیں بھی باری باری بلایا اور وہی سوال کئے جو میں نے ملنگوں سے پوچھے تھے۔ ان تینوں کے جواب ملنگوں سے مختلف نہیں تھے۔ ان میں دو آدمی مجھے عقل والے لگتے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میرا شک کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ داؤد میں اتنی ہمت نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو صرف نکھٹو اور آوارہ ہُوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس کے ایسے دوست ہیں ہی نہیں جو اس قسم کے جرم میں اس کا ساتھ دیں۔

ان سب نے ثابت کر دیا کہ داؤد تمام رات تکیے میں چرس کے نشے میں بے ہوش پڑا رہا تھا مگر میں ان جواریوں اور چرسیوں پر اتنی جلدی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ انہوں نے پہلے ہی بیان ملا لئے ہوں۔ میں ان سب کو داؤد، اُس کے دونوں بھائیوں اور باپ کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔

تھانے میں جا کر پتہ چلا کہ ابوذر بہتر ہو گیا ہے اور ایک دو دنوں بعد اُسے ہسپتال سے چھُٹی مل جائے گی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ کیس قتل کا کیس

نہ بنا۔ اُس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ میں نے اے ایس آئی کو کہا کہ وہ علاقے کے رہزنوں اور سزا یافتہ عادی مجرموں کو تھانے بلا لے۔

آج کل جرائم کے طور طریقے اور اصول بدل گئے ہیں میرے وقتوں میں جرائم پیشہ افراد کی اپنی اپنی لائن تھی۔ مثلاً رہزن صرف رہزنی کرتے تھے۔ نقب زن نقب زنی کے ہی ماہر تھے وغیرہ۔ بعض مجرموں کا طریقۂ واردات خاص قسم کا ہوتا تھا۔ وہ ہر واردات ایک ہی جیسے طریقے سے کرتے تھے۔ رہزن اپنے شکار کو مہلت دیتے تھے کہ مال اُس کے حوالے کر دو اور جاؤ۔ ہر رہزن کے اپنے الفاظ ہوتے تھے۔ میں اپنے علاقے کے رہزنوں کو جانتا تھا۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا طریقۂ واردات یہ ہوتا، یعنی شکار کو پہلے مار پیٹ کر بے ہوش کیا پھر اُس کی جیب خالی کی، پھر بھی میں نے جرائم پیشہ افراد کو بلوا لیا۔

میں اپنے گھر چلا گیا۔ یہ واردات اتنی سنگین نہیں تھی کہ میں رات کو بھی تفتیش جاری رکھتا۔ مجھے یہ شک بھی ہونے لگا تھا کہ ابوذر نے کسی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو گا اور اس عورت کے خاوند اور بھائیوں نے اس طرح انتقام لیا ہے۔

میں صبح تھانے آیا۔ میں گاؤں سے جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا ان کے علاوہ تین چار جرائم پیشہ آدمی بھی آ گئے تھے۔ میں یہ کیس اے ایس آئی کو دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میں تھانے پہنچا ہی تھا کہ اے ایس آئی میرے پاس آیا اور مجھے دفتر میں لے گیا۔ اُس نے ایک ہندو کانسٹیبل کا نام لے کر کہا میں اُس کے بکس کی تلاشی لوں۔

"وہ آج آپ سے پانچ دس دنوں کی چھُٹی مانگے گا" — اے ایس آئی نے کہا — "چھُٹی کے لئے وہ کوئی بہانہ پیش کرے گا۔ آپ اُس سے پہلے اُس کی تلاشی لیں۔"

"کیا ہے اُس کے پاس؟"

"یہ میرا شک ہے" — اے ایس آئی نے کہا — "مضروب (ابوذر)

کی انگوٹھی اور رقم اس کے پاس ہے" ـــــ اُس نے ایک اور کانسٹیبل کا نام لے کر کہا ـــــ "اُس نے اس کانسٹیبل کو بکس کے نیچے کچھ چھپاتے دیکھا تھا۔ اُس نے جھلک سی دیکھی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ جو چیز اُس نے بکس میں کپڑوں کے نیچے چھپاتی ہے وہ رقم ہے اور اس کے ساتھ انگوٹھی ہے ..... وہ کل سے کہہ رہا ہے کہ اُسے چھٹی جانا پڑے گا۔ وہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اُسے گاؤں کے کسی آدمی نے آکر اطلاع دی ہے کہ اُس کے گھر میں کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے"۔

"تمہیں یہ شک کیوں ہوا ہے؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "سوچ لو۔ میں اُس کی تلاشی لوں اور کچھ بھی برآمد نہ ہو۔ میری شرمساری ہو گی"۔

"مجھے شک اس لئے ہوا ہے" ـــــ اے ایس آئی نے کہا ـــــ "کل جب مضروب کو چارپائی پر تھانے میں لاتے تھے اُس وقت ابھی اندھیرا تھا۔ اذان اس کے بعد ہوئی تھی۔ پہلے کانسٹیبل نے بتایا ہے کہ مضروب کی چارپائی برآمدے میں رکھی گئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ایک کانسٹیبل کو آپ کو اطلاع دینے کے لئے بھیجا اور خود دفتر میں چلا گیا۔ اُس نے مضروب کو لانے والوں کو دفتر میں بلا ا اور ان سے ضروری باتیں پوچھیں۔ وہ باہر آیا تو یہ کانسٹیبل مضروب کی چارپائی سے ہٹ کر بارک میں جا رہا تھا۔ باقی کانسٹیبل ابھی سوئے ہوئے تھے۔ برآمدے میں یہ اکیلا تھا۔ مجھے یہ ساری بات ہیڈ کانسٹیبل نے بتائی ہے۔ اُسے بھی شک ہے کہ اس کانسٹیبل نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ اب یہ چھٹی کسی اور بہانے سے لے گا لیکن یہ رقم اور انگوٹھی اپنے گھر والوں کو دینے جا رہا ہے"۔

"تم جاؤ" ـــــ میں نے اے ایس آئی سے کہا اور اُس کے جانے کے بعد اُس کانسٹیبل کو بلا کر پوچھا ـــــ "صبح جب مضروب کو یہاں لایا گیا تھا تو تم اُس کے پاس کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ نہیں ملک صاحب!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے باہر آکر دیکھا کہ یہ لاش کس کی ہے"۔

"لاشہ داس!" ـــــ میں نے اُسے کہا ـــــ "ایک کام کرو اور اپنی نوکری

کو بچاؤ۔ مضروب کی جیب سے تم نے جو رقم نکالی ہے اور اُس کی انگلی سے جو انگوٹھی اُتاری ہے وہ خود ہی مجھے دے دو۔ اگر میں نے تلاشی لے کر یہ مال برآمد کیا تو تم جانتے ہو کیا ہو گا"۔

اُس نے جس طرح گھبرا کر اور ہکلا کر انکار کیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ چور ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے مہلت نہیں دوں گا۔ وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ بارک میں گیا اور رقم اور انگوٹھی رومال میں بندھی ہوئی میرے حوالے کر دیں اور جھک کر میرے پاؤں چھو لئے۔

"بڑی مجبوری کی حالت میں یہ چوری کی تھی" ـــــ اُس نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

اُس نے اپنے گھر کی ایک مجبوری بتائی۔ میں نے اُسے کہا کہ لوگ مجبور ہو کر ہی چوری چکاری کیا کرتے ہیں لیکن قانون مجبوریاں نہیں سُنا کرتا۔ میں ذاتی طور پر اُس کی مجبوری کی داستان سُن کر متاثر ہو گیا تھا۔ اگر میں اُس کو بخش دیتا تو تھانے میں بے ہوش زخمیوں اور لاشوں کی جیبیں صاف کرنے کی رسم چل پڑتی۔ یہ جُرم معمولی نہیں تھا۔ میں آپ کو سُنا چکا ہوں کہ میں نے تفتیش کو کس لائن پر ڈال دیا تھا۔ اس میں کتنا سرکاری وقت ضائع ہوا اور میں نے کتنے بے گناہ آدمیوں کو پریشان کیا۔ اس کانسٹیبل کے خلاف میں نے کارروائی کرنے کے لئے اے ایس آئی کو کہہ دیا تھا۔

بہو کا چال چلن کیسا تھا؟

رقم اور انگوٹھی مل جانے سے یہ شک صاف ہو گیا کہ یہ رہزنی کی واردات تھی اور میں اپنے اس شک کو بھی صاف ہی سمجھتا تھا کہ اُس کے مزارعوں نے اسے مارا پیٹا ہے۔ اب یہ شک سامنے آگیا کہ یہ انتقامی کارروائی ہے۔ میں نے اب انتقام کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ الوذرا ابھی ہسپتال میں تھا میری

نظر میں اب اس کیس کی نوعیت معمولی رہ گئی تھی۔ اس کے مزارعوں کے گاؤں کے نمبردار نے اس کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ابوذر عورت باز ہے۔ اسی سلسلے میں اس پر یہ حملہ ہوا ہے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس کے کردار کے متعلق مزید معلومات حاصل کر لی جائیں۔ یہ تو میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ پولیس کے خفیہ ذرائع کیا کیا ہوتے ہیں۔

میں دو دن اس کام میں لگا رہا۔ جو رپورٹیں مجھے ملیں وہ ابوذر کے خلاف جاتی تھیں۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ابوذر کوئی بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ بظاہر معزز آدمی تھا۔ ملنسار تھا۔ اپنی برادری میں اور شہر میں بھی اس کی عزت تھی لیکن اس کی یہ عادت بھی تھی کہ کوئی عورت اچھی لگتی تو اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

آپ نے ایسے آدمی دیکھے ہوں گے جو بظاہر شریف اور قابل احترام ہوتے ہیں لیکن درپردہ عورت ان کی کمزوری بنی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت ابوذر کی تھی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کے تعلقات کتنی عورتوں کے ساتھ ہیں تو مجھے سوائے ایک ہندو عورت کے کسی دوسری عورت کا نام پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ عام بدمعاشوں جیسا بدکردار آدمی نہیں تھا۔

ابوذر ہسپتال سے فارغ ہو گیا اور وہاں سے سیدھا تھانے میں آیا۔ میں نے اسے بٹھا لیا۔ اس سے میں کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ تین آدمی جو اسی شہر کے معلوم ہوتے تھے آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی ایک جوان عورت لاپتہ ہو گئی ہے۔ میں نے ابوذر سے کہا کہ وہ ابھی گھر چلا جائے اور شام کو آئے۔ میں نے اسے یہ بتا دیا کہ اس کی رقم اور انگوٹھی مل گئی ہے لیکن یہ مال اسے ابھی ملے گا نہیں کیونکہ یہ شہادت کے طور پر کانسٹیبل کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے استعمال ہو گا۔

ان تین آدمیوں میں جو عورت کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آئے تھے،

ایک اس کا سسر تھا، دوسرا اس کا باپ اور تیسرا اس کا چچا۔ انہوں نے جو تفصیل سنائی وہ اس طرح تھی کہ اس عورت کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اچھی شکل وصورت اور قدرے گورے رنگ کی عورت تھی۔ رہنے والی کسی گاؤں کی تھی۔ اس کے سسرال اس قصبے میں تھے۔ دو اڑھائی مہینے گزرے اس کا خاوند مر گیا تھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ الگ مکان میں رہتی تھی۔ اس کے سسرال کا گھر اس کے گھر کے ساتھ تھا۔ یعنی دیوار ایک ہی تھی۔

خاوند کی وفات کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے ماں باپ کے پاس چلے جانے یا دو چار مہینے اپنے سسرال میں رہنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ کچھ عرصہ اسی مکان میں رہے گی جس میں اس نے خاوند کے ساتھ آٹھ سال گزارے تھے۔ اس عورت کو پہلے یہ صدمے پہنچے تھے کہ ایک لڑکا پیدا ہوا جو تین چار مہینے کا ہو کر مر گیا۔ تین چار سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بھی چند مہینوں بعد مر گئی۔ اس کے بعد کوئی بچہ نہ ہوا۔

اس کے سسرال نے اسے مجبور نہ کیا کہ وہ اکیلی نہ رہے۔ چونکہ سسرال اور اس کے مکان کی دیوار سانجھی تھی اس لئے اس کے اکیلے رہنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مکان کے دوسری طرف والا گھر بھی ان کے قریبی رشتہ داروں کا تھا۔ میں نے یہ تمام تفصیلات ان لوگوں سے حاصل کی تھیں۔

گمشدگی کی تفصیل یہ بتائی گئی کہ دو روز پہلے وہ گھر سے غائب پائی گئی۔ جب سے اس کا خاوند مرا تھا اس نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا سوائے اس کے کہ عصر کے وقت قبرستان پر جاتی اور خاوند کی قبر پر فاتحہ پڑھتی تھی۔ اب وہ گھر سے غائب پائی گئی تو کچھ دیر انتظار کیا گیا کہ قبرستان گئی ہو گی اور ابھی واپس آ جائے گی، لیکن وہ نہ آئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تب کسی کو قبرستان بھیجا گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ سب یہ سوچ کر حیران ہوتے تھے کہ اس نے کسی کے گھر جانا تو چھوڑ ہی دیا تھا پھر وہ کہاں گئی۔

شام تک بھی نہ آئی تو یہ امید ختم ہو گئی کہ وہ خود کہیں چلی گئی ہے اور

واپس آجائے گی۔ ایک آدمی کو اس کے میکے گاؤں بھیجا گیا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں وہ جا سکتی تھی۔ گاؤں سولہ سترہ میل دُور تھا۔ اگلی صبح وہ آدمی واپس آگیا۔ اس کے ساتھ لڑکی کا باپ اور چچا بھی آگیا۔ وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ ان لوگوں نے اُس کی تلاش میں ایک دن اور ایک رات اور ضائع کر دی۔ کسی کی جوان لڑکی لاپتہ ہو جائے تو لوگ بے عزتی سے ڈرتے خفیہ خفیہ تلاش کرتے رہتے ہیں اور پولیس کے پاس اُس وقت جاتے ہیں جب تین چار دن بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہوتا ہے اور لڑکی بہت دُور پہنچائی جا چکی ہوتی ہے۔

میں نے گمشدہ عورت جس کا نام شفیقہ تھا کے باپ، چچا اور سُسر سے الگ الگ پوچھ گچھ کی۔ پہلے تو میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شفیقہ کے ساتھ سُسرال کا سلوک کیسا تھا۔ اُس کے باپ اور چچا نے بلا جھجک کہا کہ اُن کی بیٹی سُسرال میں بہت خوش تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ اپنی آزاد زندگی گزار رہی تھی۔ انہوں نے اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ اُن کی بیٹی بیوہ ہو کر اُسی مکان میں رہتی تھی تو سُسرال نے اُسے وہیں رہنے دیا اور اُس کی دیکھ بھال اور دلجوئی اپنی بیٹیوں کی طرح کرتے رہے۔

شفیقہ کے سُسر نے اس کی بہت تعریف کی۔ آنسو بہاتے ہوئے اُس نے کہا کہ یہ تو ہماری اپنی بیٹی تھی۔

"میں آپ سے ایک نازک سی بات پوچھنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "لیکن آپ پردہ ڈالنے کی کوشش کریں گے .... آپ کی بہو کا چال چلن کیسا تھا؟"

"سولہ آنے صحیح تھا جناب!" — اُس نے جواب دیا — "سارے محلے سے، ہماری پوری برادری سے بلکہ ہمارے دشمنوں سے بھی پوچھ لیں۔ شفیقہ کے خلاف کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلے گا۔"

"میں جانتا تھا آپ یہی کہیں گے" — میں نے کہا — "خاندان کا بزرگ اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں نکالے گا کہ اُس کے خاندان کی کوئی عورت

بدچلن ہے .... آپ بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "مجھے اور میرے خاندان کے ہر فرد کو شفیقہ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس پر ایسا فضول شک کرنا ہم گناہ سمجھتے تھے .... میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ یہ شخص جو ابھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا .... ابوذر .... ہماری برادری اور کچھ قریبی رشتہ داری کا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے یہ ہماری ساری برادری کا حادثہ ہے۔ شفیقہ کے خاوند یعنی میرے بیٹے کی وفات کے بعد ابوذر چار پانچ مرتبہ شفیقہ کے گھر گیا اور کچھ دیر بیٹھا رہا۔"

اُس نے جب ابوذر کا نام لیا تو میں چونک پڑا۔ مجھے روشنی کی ایسی کرن نظر آئی جس نے اندھیرے میں مجھے کچھ دکھا دیا۔ میں شفیقہ کے سُسر کا بیان اور زیادہ غور سے سُننے لگا۔

"ابوذر کا شفیقہ کے پاس جانا قابلِ اعتراض تھا" — شفیقہ کا سُسر کہہ رہا تھا — "اعتراض سے آپ کچھ اور نہ سمجھیں۔ اعتراض یہ تھا کہ شفیقہ ابھی عدت میں تھی اور آپ جانتے ہیں کہ اس عرصہ میں بیوہ کسی نامحرم کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتی، مگر ابوذر اس کے گھر جاتا تھا۔ ہمیں چونکہ شفیقہ کے کردار پر بھروسہ تھا اس لئے ہم نے اعتراض نہ کیا۔"

"کیا ابوذر آپ کے بیٹے کی زندگی میں اُس کے گھر جایا کرتا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"جاتا ہوگا جی!" — اُس نے جواب دیا — "میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ابوذر اچھی شہرت کا آدمی نہیں؟"

"بعض لوگ اُس کے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "لیکن جناب! لوگ کسی کو اچھا نہیں کہتے۔ ابوذر میں سر اُونچا رکھنے کی عادت ہے اس لئے کچھ لوگ اُس سے جلتے ہیں۔"

یئں نے جب دیکھا کہ یہ شخص ابوذر کو شریف آدمی سمجھتا ہے تو اُس سے اس معاملے میں مزید بحث ضروری نہ سمجھی البتہ ایک بڑا پختہ شک اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ گمشدگی کی رپورٹ باقاعدہ طور پر درج کرنے کے لئے میں نے اُن لوگوں سے تمام ضروری معلومات، حلیہ، لباس وغیرہ لے لیں اور لاپتہ عورت کے سُسر کے نام سے ایف آئی آر تحریر کر لی اور ان لوگوں کو فارغ کر دیا۔

میرا سب سے پہلا شک ابوذر پر تھا۔ میں اس سٹیج پر ابھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابوذر نے اس عورت کو اغوا کرایا ہے یا وہ ابوذر کی خاطر اپنی مرضی سے گھر سے نکل گئی ہے۔ اپنی مرضی سے گھر سے نکلنا بے معنی سا معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ ابوذر کی خاطر گھر سے نکل گئی تھی تو گئی کہاں۔ اُسے گھر سے بھاگنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ دو تین مہینے بعد وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی تھی۔

پیچھے یہ شک میرے ذہن میں رہ گیا کہ ابوذر اُس کے گھر جاتا رہا۔ اُسے ورغلاتا رہا اور جب مایوس ہو گیا یا شفیقہ نے اُسے دھتکار دیا تو ابوذر نے اُسے گھر سے اُٹھوا کر غائب کرا دیا۔

یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ابوذر نے شفیقہ پر دست درازی کی۔ شفیقہ نے اُسے کہا کہ وہ اپنے سُسرال کو بتا دے گی۔ شفیقہ کا ردِعمل شدید اور خطرناک ہو گا۔ اس سے بچنے کے لئے ابوذر نے اُسے اغوا کرا دیا۔ اب اُس عورت کو قتل ہونا تھا، لیکن میرے اس شک کو یہ خیال رفع کر دیتا تھا کہ یہ عورت جس وقت لاپتہ ہوتی اُس وقت ابوذر ہسپتال میں تھا۔

یہ میری اپنی سوچیں اور قیاس آرائیاں تھیں اور میں ان کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اس قسم کی وارداتوں کی تفتیش میں عقل اور تجربہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ جوان عورت کے اغوا کے اسباب یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے گئی یا اُسے زبردستی اُٹھایا گیا یا خاندانی عداوت میں وہ انتقام کا نشانہ بنی۔

اس موقعہ پر پولیس اپنے وہ ذرائع استعمال کرتی ہے جنہیں عام اصطلاح میں مخبر کہا جاتا ہے۔ یہ بھی میں آپ کو پہلے کبھی بتا چکا ہوں کہ پولیس کے مخبر کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔

دروازہ اندر سے بند تھا

میں نے سب سے پہلے ابوذر کو ہی بلا لیا۔ میں یہ توقع تو رکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اگر اس عورت کی گمشدگی میں ملوث ہے تو آتے ہی مجھے صحیح بات بتا دے گا، لیکن مجھے اپنے تجربے پر بھروسہ تھا۔ میں اُس کے انکار سے یا باتوں سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس واردات کے ساتھ اُس کا تعلق ہے یا نہیں یا اس عورت کے ساتھ اُس کے تعلقات کیا تھے۔ وہ تھوڑی ہی دیر بعد میرے پاس آ گیا۔

"ابوذر!" — میں نے اُسے کہا — "اب اپنے آپ کو معزز سمجھنا چھوڑ دو۔ ان چار پانچ دنوں میں تمہارے متعلق کم از کم پچاس آدمیوں کے ساتھ بات ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ ابوذر شریف آدمی ہے۔

میں تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس وقت سچ بول دو تو معاملہ یہیں گول کر دوں گا شرط یہ ہے کہ یہ بتا دو شفیقہ کہاں ہے"۔

"جناب عالی!" — اُس نے کہا — "میں اب گھر پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے۔ میں تو ہسپتال میں پڑا تھا"۔

"کیا یہ میں نہیں جانتا کہ تم ہسپتال میں پڑے تھے" — میں نے کہا — "میں وہ باتیں بھی جان گیا ہوں جو تم سمجھتے ہو گے کہ مجھے معلوم نہیں ہوں گی"۔

"میں عزت دار اور خاندانی آدمی ہوں جناب!" — ابوذر نے کہا — "آپ مجھ پر کوئی اور الزام لگائیں۔ اغوا کا الزام مجھ پر نہ تھوپیں"۔

"عزت دار اور خاندانی آدمی اپنے مزارعوں کی بیویوں سے جوتے

نہیں کھایا کرتے" — میں نے کہا — "تم اپنے مزارعے کی بیوی کے دھتکارے ہوئے آدمی ہو..... جس نمبردار کو تم اپنا دوست سمجھتے ہو وہ سرکار کا آدمی ہے۔ اُس کی وفاداری اس تھانے کے ساتھ ہے۔ نمبردار تو اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی ڈنک مار جایا کرتے ہیں۔ تم نے اُن غریبوں سے دھونس سے زیادہ رقم وصول کی۔"

"جنابِ عالی.....!"

"پہلے میری بات سُن لو" — میں نے اُسے بولنے نہ دیا — "تم شفیقہ کے گھر کیا لینے جاتے تھے؟"

"اُس کا خاوند میرا دوست تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"اُس کی بیوی تو تمہاری دوست نہیں تھی" — مَیں نے کہا — "مَیں تمہاری زبان سے سیدھی ایک بات سُننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس بیوہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس نے تمہیں اُسی طرح دھتکار دیا جس طرح مزارعہ کی بیوی نے تمہیں دُھتکارا تھا اور تم نے ایسے وقت شفیقہ کو انتقاماً اغوا کرایا جب تم ہسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔"

اُس نے اُچھل اُچھل کر اور تڑپ تڑپ کر کہنا شروع کر دیا کہ ایسا بالکل نہیں ہُوا اور شفیقہ پر اُس کی نیت ایسی نہیں تھی لیکن میں اس کے انکار کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ" — مَیں نے پوچھا — "شفیقہ کا چال چلن کیسا تھا؟ کوئی اور آدمی بتاؤ جس کے ساتھ شفیقہ کے درپردہ تعلقات تھے۔ تمہاری نجات اس میں ہے کہ کسی اور کا نام بتاؤ۔"

"شفیقہ بدچلن نہیں تھی" — اُس نے کہا — "خاوند کے ساتھ اُسے بہت محبت تھی لیکن جناب! دلوں کا حال کون بتا سکتا ہے۔ مجھے ایک آدمی کا شک ہے۔ شفیقہ اُسے بہت چاہتی تھی اور وہ شفیقہ کے پاس جاتا رہتا تھا۔ وہ ہماری برادری کا لڑکا ہے۔ اُس کی عمر بائیس تیئیس سال ہے۔ اُس کا نام مصطفٰے ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ اُس کی بیوی بڑی خوبصورت لڑکی ہے لیکن مصطفٰے اُسے بسانا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے کہ اُسے اچھی نہیں لگتی۔ تین چار مہینوں سے لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی ہے اور مصطفٰے شفیقہ کے گھر جاتا رہتا ہے اور بہت دیر وہیں رہتا ہے۔"

ابوذر اچانک چُپ ہو گیا۔ کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ایک بات یاد آگئی ہے" — اُس نے کہا — "اُس رات جب مجھ پر حملہ ہُوا تو بے ہوش ہونے سے پہلے اُن تین آدمیوں میں سے کسی ایک نے مجھے کہا، پھر جاؤ گے شفیقہ کے پاس۔ اگر پھر تمہیں اُس گھر میں قدم رکھتے دیکھا تو قتل ہو جاؤ گے۔"

"یہ بات تم نے مجھے اُس وقت کیوں نہ بتائی جب تم ہسپتال میں بیان دے رہے تھے؟"

"سر پر جو چوٹیں پڑی تھیں اُن کا اثر ابھی باقی تھا" — اُس نے جواب دیا — "شاید یہی وجہ تھی کہ میں یہ بات آپ کو بتانا بھول گیا..... میں نے اُس آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ مصطفٰے کی آواز تھی" — اُس نے فاتحانہ لہجے میں بڑے جوشیلے انداز میں کہا — "اب معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ مجھ پر حملہ کرنے والوں میں مصطفٰے بھی تھا اور اُس کے ساتھ اُس کے دوست ہوں گے۔"

"دشمنی کیا تھی؟" — میں نے پوچھا — "اگر اُس وقت اُس نے تمہیں کہا تھا کہ پھر کبھی شفیقہ کے گھر جاؤ گے تو قتل ہو جاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اُس سے پہلے بھی اُس نے تمہیں شفیقہ کے گھر جانے سے روکا تھا۔ اس بات پر تمہاری اور اُس کی تلخ کلامی ہوتی ہوگی..... دیکھو ابوذر! میں نہیں مانتا کہ تم اتنی اہم بات بھول گئے تھے۔ میں نے تمہیں کہا ہے کہ سچ بولو۔ شفیقہ کو سامنے لاؤ

اور جاؤ چھٹی کرو۔ ابھی تو میں معاملہ یہیں پر ختم کر سکتا ہوں۔ اگر تم چالاک اور ہوشیار بننے کی کوشش کرو گے تو بہت بُرے انجام کو پہنچو گے۔ تم نے جن سے مار کھائی ہے میں اُنہیں نہیں پکڑوں گا اُلٹا تمہیں دھر لوں گا۔"

"جناب ملک صاحب! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ اس عورت کو میں نے اغوا نہیں کرایا" — اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا — "میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا ہوں۔"

"ذرا ٹھہرو" — میں نے کہا اور باہر جا کر ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ فلاں محلے سے مصطفےٰ نام کے لڑکے کو تھانے لے آئے۔ میں پھر اپنے دفتر میں جا بیٹھا اور ابوذر سے کہا — "اب بولو کیا بات بتانا چاہتے ہو۔"

"سچ بات یہ ہے ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "شفیقہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"پہلی بیوی کی چھٹی کرانی تھی؟"

"جی!" — اُس نے جواب دیا — "وہ اللہ کی گائے ہے، لیکن میں نے یہ ارادہ دل سے نکال دیا ہے۔"

"شفیقہ نے دُھتکار دیا ہوگا" — میں نے طنزیہ کہا۔

"ایسی بات نہیں ہوتی جی!" — اُس نے کہا — "مجھے شفیقہ کے چال چلن پر شبہ ہو گیا تھا۔ مصطفےٰ اُس کے پاس جاتا تھا۔ ایسے بھی ہُوا کہ میں وہاں بیٹھا ہُوا ہوں اور مصطفےٰ آگیا۔ اُسے دیکھ کر شفیقہ کے چہرے پر رونق آگئی۔ اُس کے ساتھ اس طرح باتیں کرتی تھی جیسے وہ اُس کا بیٹا یا بھائی ہو۔ میرے ساتھ اس نے کبھی اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ مصطفےٰ کی موجودگی میں وہ میری طرف سے نظریں ہی پھیر لیتی تھی۔ میں شفیقہ کو پاک صاف چال چلن کی عورت سمجھتا تھا لیکن مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ ہر کسی کے لئے پاک صاف ہے مصطفےٰ کے لئے نہیں۔ مصطفےٰ کے ساتھ اس کا تعلق صحیح نہیں تھا۔"

"تمہیں یہ یقین کس طرح ہُوا؟"

"دو دفعہ ایسے ہُوا کہ میں شفیقہ کے گھر گیا تو دروازہ اندر سے بند تھا" — اُس نے جواب دیا — "شفیقہ نے اندر سے دروازہ کبھی بند نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ تو میں دروازہ بند دیکھ کر واپس آگیا اور گلی کے آخر میں کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اندر سے مصطفےٰ نکلا۔ دوسری دفعہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ شفیقہ نے کھولا۔ میں اندر گیا تو مصطفےٰ بیٹھا ہُوا تھا....

"ایک روز مصطفےٰ نے مجھے گلی میں روک لیا اور کہنے لگا کہ شفیقہ کے گھر نہ جایا کرو۔ میں اُس کی یہ بات سُن کر بہت حیران ہُوا۔ کل کا بچہ مجھے دھونس دکھا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے ذرا آنکھیں دکھاؤں گا تو یہ دبک جاتے گا لیکن یہ تو میرے گلے پڑ رہا تھا۔ میں اس خیال سے برداشت کر گیا کہ اس کے باپ اور بھائیوں تک بات پہنچے گی تو لمبا فساد ہوگا۔"

ابوذر نے اپنی اور مصطفےٰ کی چپقلش کی ذرا لمبی داستان سنائی۔ اس سے میری دلچسپی صرف یہ تھی کہ مجھے اس میں سے شفیقہ کی گمشدگی کا کوئی سراغ ملتا ہے یا نہیں اور ابوذر کی جو پٹائی ہوتی تھی اس کے متعلق کوئی شہادت ملتی ہے یا نہیں۔ میں آپ کو مختصراً بتا دیتا ہوں کہ مصطفےٰ اس کے پیچھے پڑا رہا کہ شفیقہ کے گھر نہ جایا کرو۔

ایک روز ابوذر نے اُسے کہا کہ وہ اُس کا شفیقہ کے ہاں جانا بند کرا دے گا۔ اس بات پر ان میں ہاتھا پائی تو نہ ہوئی لیکن گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ ابوذر نے مجھے بتایا کہ وہ لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے وہ کھسک گیا لیکن اُن کے درمیان دشمنی گہری ہو گئی۔ اس سے تین چار روز بعد ابوذر پر حملے کی واردات ہو گئی۔

"مصطفےٰ کو کس طرح پتہ چلا تھا کہ تم اُس گاؤں گئے ہوئے ہو؟" — میں نے ابوذر سے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" — اُس نے جواب دیا — "کسی نے اُسے بتا دیا ہوگا۔"

ابوذر جب مجھے یہ داستان سُنا رہا تھا اُس وقت وہ کانسٹیبل واپس آ گیا جسے میں نے مصطفیٰ کو بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ مصطفیٰ کے گھر والوں نے بتایا تھا کہ مصطفیٰ کہیں باہر چلا گیا ہے۔ شاید دو تین دنوں تک واپس آجاتے گا۔ یہ سُنتے ہی تیر کی طرح ایک شک میرے ذہن میں آ لگا۔ شفیقہ پہلے چلی گئی تھی اور مصطفیٰ ایک دو دنوں کا وقفہ دے کر چلا گیا۔ اگر ایسا ہی ہُوا تھا تو میری سر دردی ختم تھی۔ شفیقہ نابالغ بچی نہیں تھی کہ مصطفیٰ اُسے اُٹھا کر لے گیا تھا۔ اگر ابوذر ٹھیک کہتا تھا کہ شفیقہ مصطفیٰ کو چاہتی تھی تو میری تفتیش ختم ہو گئی تھی تاہم کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لئے میں نے شفیقہ کے وارثوں پر ثابت کرنا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے فلاں لڑکے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ میں نے اسی کانسٹیبل کو بھیجا کہ مصطفیٰ کے باپ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

میں نے ابوذر کو یہ کہہ کر باہر بٹھا دیا کہ وہ اچھی طرح سوچ کر مجھے بتائے۔ میں نے اُسے یہ تاثر دیا کہ میں نے اُس کے بیان کو سچ نہیں مانا۔

رنگین مزاج نوجوان بیوہ

مصطفیٰ کا باپ آیا تو میں نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور پوچھا کہ مصطفیٰ کہاں چلا گیا ہے۔

"مرضی کا مالک ہے جناب!" — اُس نے جواب دیا — "کہیں سیر سپاٹے کے لئے نکل گیا ہوگا یا مربعوں پر چلا گیا ہوگا۔ ہماری دو مربع زمین نہری علاقے میں ہے۔ کبھی کبھی وہ وہاں چلا جاتا ہے۔"

"مطلب یہ ہُوا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے" — میں نے کہا — "اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکا آپ کے کنٹرول میں نہیں۔"

"جیسا آپ سمجھ لیں" — اُس نے کہا — "شادی شدہ ہے میں نے اُس پر کبھی حکم نہیں چلایا۔"

"بیوی تو اُس کی گھر بیٹھی ہے" — مَیں نے کہا — "اور محترم! آپ نے شاید ابھی تک محسوس نہیں کیا کہ میں تفتیش کر رہا ہوں۔ آپ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کسی عام شہری نے آپ سے کچھ پوچھا ہو اور آپ اُسے ٹال رہے ہوں۔"

"نہیں حضور!" — اُس نے بدلے ہوتے لہجے میں کہا — "آپ تفتیش کریں۔ میں ہر بات بتاؤں گا ... کیا میرے بیٹے پر کوئی الزام ہے؟"

"جی ہاں!" — میں نے کہا — "اُس پر دو الزام ہیں لیکن آپ مجھے میرے سوالوں کے جواب دیں ... کیا مصطفیٰ شفیقہ کی خاطر اپنی بیوی کو اپنے گھر نہیں بسا رہا یا کوئی اور وجہ ہے؟"

"معلوم نہیں جناب!" — باپ نے جواب دیا — "اتنی خوبصورت لڑکی کو وہ پسند نہیں کرتا۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ میرے بیٹے اور بہو پر کسی دُشمن نے اُلٹے تعویذ کرا دیتے ہیں۔ میں نے اُس کا توڑ کیا ہے لیکن کچھ اثر نہیں ہُوا۔"

"تعویذ نہیں جناب!" — میں نے طنزیہ کہا — "یہ شفیقہ کا جادو چلا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ شفیقہ کے گھر گھُسا رہتا تھا؟"

"اتنا تو نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "مصطفیٰ دس گیارہ سال کا تھا جب اُس کی ماں فوت ہوئی تھی۔ شفیقہ ہمارے گھر جایا کرتی تھی۔ مصطفیٰ بچہ تھا۔ شفیقہ جوان تھی اور شادی شدہ بھی تھی۔ وہ مصطفیٰ کے ساتھ بڑا پیار کرتی تھی۔ یہ ہر وقت روتا رہتا تھا۔ اپنی بہنوں سے بھی نہیں بہلتا تھا۔ شفیقہ اُس کی بہنوں کے پاس آیا کرتی تھی اور کبھی کبھی اُسے اپنے گھر لے جاتی تھی۔ اس طرح مصطفیٰ شفیقہ کا ہی ہو کے رہ گیا۔ یہ بڑا ہوتا گیا لیکن شفیقہ کے لئے یہ "بچہ" ہی رہا۔ اس کے ساتھ ہی مصطفیٰ خود سر ہو گیا۔ میں بھی، اُس کا بڑا بھائی اور بہنیں بھی اُس کے ساتھ اتنا پیار کرتے تھے جو ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس پیار نے اُسے بگاڑ دیا۔ میں نے یہاں تک دیکھا کہ یہ میری بات نہیں سُنتا تھا۔ شفیقہ

کی سُن لیتا اور مانتا تھا۔ اب شادی کر کے بھی وہ شفیقہ کے گھر جاتا ہے تو ہم اعتراض نہیں کرتے۔"

"شفیقہ کہاں ہے؟"

"سُنا ہے کہیں چلی گئی ہے" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ اچھے چال چلن کی عورت نہیں تھی" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر اُس کا چال چلن واقعی اچھا نہیں تھا تو وہ آپ کے بیٹے کو بھی خراب کرتی رہی ہے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "بغیر ثبوت کے کسی عورت کو بدچلن کہہ دینا میرے اصول کے خلاف ہے۔"

اس کے علاوہ میں نے اس شخص سے بہت سی باتیں پوچھیں لیکن مجھے کوئی سراغ نہ ملا اور اپنے بیٹے کے متعلق وہ پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے پر پردہ ڈال رہا ہو۔

"مجھے مصطفےٰ چاہیئے" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "کل شام تک اُسے تھانے میں حاضر کریں۔ اگر آپ نہیں کریں گے تو میں اُسے اشتہاری مُلزم قرار دے دوں گا۔"

"بہت اچھا جناب!" ــــ اُس نے کہا۔

میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے شفیقہ کی گمشدگی کا کوئی غم نہیں تھا۔ مصطفےٰ ابوذر پر حملے کا مُلزم تھا۔ یہ حملہ قاتلانہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مصطفےٰ کے سُسر کو بلایا جائے۔ اُس کی نوجوان بیٹی گھر بیٹھی ہوئی تھی اس لئے مجھے اُمید تھی کہ صحیح باتیں اُسی کے مُنہ سے نکلیں گی۔ میں نے اُسے بلوا لیا۔

مجھے بتایا گیا کہ تین چار آدمی آتے بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ایک تو پکا مُخبر تھا یعنی جسے کچھ سرکاری وظیفہ مل جاتا تھا۔ باقی تین وہ معززین تھے جو طُرّے اُونچے رکھتے تھے اور اپنے آپ کو عام لوگوں سے بہت اُونچے انسان سمجھتے تھے

لیکن تھانے میں آکر اُن کے طُرّے اور دکھاوے کا اونچا پن تھانیدار کے آگے جُھک جاتا تھا۔ تھانیداروں کو خوش کرنے کے لئے وہ پکّے مخبروں سے زیادہ اچھی مخبری کرتے تھے۔ تھانیداروں کو وہ اس لئے خوش رکھتے تھے کہ جب کبھی ضلع کا ڈپٹی کمشنر یعنی انگریز دورے پر آتا تھا تو تھانیدار اُن کے لئے موقع پیدا کر دیتے تھے کہ وہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے قریب جا کر سلام کر سکیں اور صاحب بہادر اگر موج میں آجائیں تو اُن کے ساتھ ہاتھ ملا لیں۔

میں نے انہیں باری باری بلایا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شفیقہ، ابوذر اور مصطفےٰ کا چال چلن کیسا ہے اور اُن کے درمیان کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور کیا وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ شفیقہ کیسے لاپتہ ہو گئی ہے۔

ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ شفیقہ بدچلن تھی لیکن مصطفےٰ کے بار بار وہاں جانے کی وجہ سے ان سب نے کہا کہ ان دونوں کے آپس کے تعلقات میں شُبہ کیا جا سکتا ہے۔ ان سب نے کہا کہ شفیقہ نے اگر مصطفےٰ کو مُنہ بولا بھائی بنا رکھا ہے تو مصطفےٰ نے اپنی اتنی خوبصورت بیوی کو بسایا کیوں نہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔

ابوذر کے متعلق ان سب نے کہا کہ گھٹیا ذہنیت کا آدمی ہے۔ عورت کو اُس نے اپنی کمزوری بنا رکھا ہے لیکن اُس کی ہسٹری یہ ہے کہ جس عورت کے قریب جاتا ہے وہ اُسے دُھتکار دیتی ہے۔ خود اپنی بیوی اسے پسند نہیں کرتی۔ اپنے سالوں سے بھی اُس نے جُوتے کھاتے ہیں۔ شفیقہ بیوہ ہو گئی تو اس نے اُس کے گھر جانا شروع کر دیا۔

"یہ بتاؤ" ــــ میں نے یہ سوال ہر ایک سے کیا ــــ "شفیقہ اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہ چلی گئی؟"

"اُس کے سُسرال والے ابھی اپنے بیٹے کی موت کے صدمے میں ہیں" ــــ ان سب کا جواب تقریباً ایسا ہی تھا ــــ "وہ کہتے ہیں شفیقہ عدّت پوری کر رہی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ابوذر اور مصطفےٰ جیسے جوان آدمی

اُس کے گھر جاتے ہیں۔"

اُن میں سے دو آدمیوں نے یہ جواب دیا کہ شفیقہ کچھ عرصہ اور یہیں گزارے گی کیونکہ وہ مصطفےٰ سے اتنی جلدی جدا نہیں ہونا چاہتی۔

"وہ گئی کہاں؟" — میں نے ان سب سے الگ الگ پوچھا۔

ان میں سے کوئی بھی مجھے پکا جواب نہ دے سکا۔ سب نے یہ کہا کہ مصطفےٰ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے طور پر گھروں سے نکلے اور کہیں چلے گئے ہیں۔

میں نے کئی اور ذرائع سے اس ڈرامے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ تقریباً سب نے ایسے ہی جواب دیئے جو میں پہلے سُن چکا تھا۔ آپ خود غور کریں کہ یہ لوگ کیسی حماقت کرتے رہے کہ جوان بیوہ کو اکیلا چھوڑے رکھا اور اُس کے پاس جوان آدمی جاتے رہے۔ اُن کی اس حماقت سے ایک تو ان دونوں جوان آدمیوں میں رقابت پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ایک نوجوان بیوی اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی، اور تیسری یہ واردات ہوگئی جس میں ابوذر کی جان بھی ضائع ہوسکتی تھی۔ ان کے لئے سب سے بڑی ذلت یہ ہوئی کہ عورت گھر سے کسی کے ساتھ نکل گئی۔

میں نے یہ سب کچھ سوچ کر اس کیس کو اُن چھوٹی چھوٹی وارداتوں کی لائن میں لگا دیا جن کی تفتیش میں کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ اُن لوگوں کو تھانے کے چکر پڑتے رہیں تاکہ اُن کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ اس کے علاوہ تھانے میں اس سے زیادہ اہم کیس اور سنگین وارداتوں کی تفتیش چل رہی تھی۔

مصطفےٰ کا سُسر آگیا۔

"آپ کی بیٹی کو آپ کا داماد بساتا کیوں نہیں؟" — میں نے مصطفےٰ کے سُسر سے پوچھا۔

"قسمت کا کھیل ہے جناب!" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "میں

جنہیں شریف اور معزز سمجھتا تھا وہ پکے بدمعاش اور بے غیرت نکلے حالانکہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں۔"

"میں وجہ پوچھ رہا ہوں۔"

"وہ جو عورت لاپتہ ہوگئی ہے یہ سب اُس کی کرتوت ہے" — اُس نے جواب دیا — "آپ کے پاس اُس کی گمشدگی کی رپورٹ پہنچ گئی ہے۔ اُس کا نام شفیقہ ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے داماد پر شفیقہ کا قبضہ ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اس میں کوئی شک ہی نہیں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "شفیقہ اُس کی ماں تو نہیں لگتی.... اب دونوں کہاں ہیں؟"

میں نے دیکھا کہ یہ شخص میرے ہر سوال کا جواب جلے کٹے الفاظ میں دیتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ ہر جُرم کا مجرم مصطفےٰ کو ثابت کرے۔ میں نے اُس سے اپنے مطلب کی کوئی بات کہلوانے کی بہت کوشش کی لیکن اُس کے پاس سراغ کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اُس سے مزید پوچھ گچھ نہ کی۔

میں نے دو دن اِس کیس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ میں نے مصطفےٰ کے باپ کو کہا تھا کہ وہ اگلی شام تک مصطفےٰ کو پیش کرے۔ میں نے اپنے اس حکم کی طرف بھی توجہ نہ دی۔

بھولا بادشاہ

صبح کے آٹھ یا شاید ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے کہ مصطفےٰ کا باپ تھانے میں آیا۔ وہ سیدھا میرے پاس آگیا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا مصطفےٰ نہیں آیا؟

"آگیا ہے جناب!" — اُس نے جواب دیا اور منت سماجت کے لہجے

میں کہنے لگا ـــ "کیا میں آپ سے درخواست کرسکتا ہوں کہ ممکن ہو سکے تو میرے بیٹے کے ساتھ کچھ رُو رعایت کردیں؟ میں باپ ہوں۔ باپ کے جذبات آپ جانتے ہیں ... مجھے جناب جو خدمت بتائیں گے کروں گا۔"

"آپ اُسے میرے پاس بھیج دیں" ـــ میں نے اُسے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا ـــ "جتنی مدد ممکن ہوسکی وہ میں کروں گا۔"

باپ باہر گیا تو ایک خوبرو نوجوان میرے دفتر میں داخل ہُوا۔ یہ مصطفےٰ تھا۔ میں نے اُسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر بائیس تئیس سال تھی لیکن وہ سولہ سترہ سال کا لگتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھولے بھالے بچوں کا سا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی مجرم کا چہرہ ہے۔

"مصطفےٰ!" ـــ میں نے اُس سے پوچھا ـــ "جھُوٹ بولو گے یا فوراً سچ بول دو گے؟"

"میں چور یا ڈکیت تو نہیں کہ جھُوٹ بول کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کروں گا" ـــ اُس نے کہا ـــ "پوچھیں آپ کیا پوچھتے ہیں۔"

"ابوذر پر حملہ تم نے کیا تھا؟"

"ہاں جی!" ـــ اُس نے بڑی دلیری یا معصومیت سے جواب دیا ـــ "میں نے راستہ روک کر اُس کی ہڈیاں ٹھونکی ہیں۔"

"تمہارے ساتھ اور کون تھا؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "میں اُن کی سزا بھی خود ہی لوں گا۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا تھا۔ دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ اب میں نے دوستی کا حق ادا کرنا ہے۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ اُس نے یہ بات بھولے پن میں کہی تھی۔ وہ نہ بھی بتاتا تو میں اُس کے دوستوں کو پکڑ سکتا تھا۔ میں نے اس واردات کو الگ کر دیا۔

"شفیقہ کہاں ہے؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "یہ بھی نہیں بتاؤ گے؟"

"معلوم ہوتا تو بتا دیتا" ـــ اُس نے کہا۔

"اگر شفیقہ تمہارے ساتھ گئی ہے تو یہ کوئی جرُم نہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "وہ بالغ عورت ہے۔ تم نے اُسے اغوا تو نہیں کیا ہوگا۔ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ گئی ہوگی۔"

"وہ میرے ساتھ نہیں گئی" ـــ اُس نے زور دے کر کہا۔

"تم کہاں گئے تھے؟"

"میں اُس کے پیچھے گیا تھا" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "وہ ملی نہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ کسی اور کے ساتھ گئی ہے؟"

"وہ اغوا ہوئی ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔ آپ میری پوری بات سُن لیں .... اُسے میرے باپ نے اغوا کرایا ہے۔ ہوسکتا ہے میرا سُسر بھی اس میں شامل ہو۔"

"اغوا کیوں کرایا ہے؟"

"مجھ سے جدا کرنے کے لئے" ـــ مصطفےٰ نے کہا۔

اُس نے وہی بات سنائی جو اُس کے باپ نے سنائی تھی۔ اپنی ماں کے مرنے کے بعد شفیقہ نے اُس کے ساتھ ایسا پیار کیا کہ وہ شفیقہ کا ہی ہو کے رہ گیا۔ اُس وقت وہ بچہ تھا اور صرف ماں کے پیار کو پہچانتا تھا۔ ماں کا پیار قبر میں دفن ہوگیا لیکن اُسے یہ پیار شفیقہ سے مل گیا۔

"اُس وقت شفیقہ کا پہلا بچہ پیدا ہُوا اور جلدی ہی مر گیا تھا" ـــ مصطفےٰ نے بیان دیتے ہوئے کہا ـــ "وہ بہت روتی تھی اور میرے ساتھ پیار کرتی تھی۔ مجھے اپنے گھر لے جاتی تھی۔ کبھی کبھی رات کو بھی اپنے پاس رکھتی تھی۔ میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ شفیقہ کے پاس میں ہوتا تھا تو میں گیارہ بارہ مہینوں کا بچہ بن جاتا تھا۔ میں اُسی کے پاس رہنا چاہتا تھا لیکن گھر والے نہیں مانتے تھے ....

"مجھے کبھی محسوس ہی نہیں ہُوا کہ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ میں سترہ اٹھارہ سال کا جوان ہو گیا لیکن شفیقہ کے سامنے میں بچہ ہی رہتا تھا۔ شفیقہ کے گھر میں پہلے کی طرح جاتا تھا اور وہ مجھے اپنا خون سمجھتی تھی۔"

"پیار بھی پہلے کی طرح کرتی تھی؟"

"نہیں جی!" — اُس نے جواب دیا — "اب وہ ایسے تو نہیں کر سکتی تھی کہ مجھے گود میں بٹھا لیتی یا اپنے ساتھ سلا لیتی۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ اب میں جوان آدمی بن گیا ہوں لیکن میرے دماغ سے بچپن نہیں نکلتا تھا۔ آپ یقین کریں شفیقہ ایسی ویسی عورت نہیں۔ اپنی عزت کا خیال رکھنے والی عورت ہے۔ اس کے خاوند کو بھی اس پر اعتبار تھا۔ اُس نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کہ ایک جوان آدمی اُس کی بیوی کے پاس آتا ہے۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا ہوں" — میں نے کہا — "ابوذر نے شفیقہ کے پاس کب جانا شروع کیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہُوا تھا؟"

"شفیقہ بیوہ ہو گئی تو ابوذر نے اُس کے پاس جانا شروع کر دیا" — مصطفیٰ نے کہا — "مجھے بہت بُرا لگا۔ میں شفیقہ کو کہنا چاہتا تھا کہ اُسے اپنے گھر آنے سے روکے لیکن شفیقہ خود ہی بول پڑی۔ اُس نے دیکھا کہ یہ تو ہر روز پھیرے لگانے لگا ہے تو اُس نے مجھے کہا کہ اُسے کس طرح منع کیا جائے۔ شفیقہ کہتی تھی کہ وہ اپنے سُسر یا اپنے خاوند کے بھائیوں سے نہیں کہنا چاہتی کہ اُسے منع کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ لڑائی جھگڑا ہو جائے گا....

"میں نے شفیقہ سے کہا کہ تم اُسے اپنے گھر میں نہیں دیکھنا چاہتیں تو میں اُسے کہہ دوں گا۔ پھر جناب! میں نے ابوذر کو روکا۔ اُس نے مجھے دھونس دکھائی۔ میں نے دو بار پھر اُسے کہا کہ وہ شفیقہ کے گھر نہ جایا کرے لیکن یہ شخص بڑا ہی ڈھیٹ ہے۔ باز نہ آیا۔ ایک روز شفیقہ نے مجھے بتایا کہ ابوذر نے اسے کہا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔ شفیقہ غصے میں تھی۔ مجھے آگ لگ گئی۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ اور ابوذر کے سالے کے

ساتھ بات کی اور انہیں کہا کہ اس کی ہڈیاں توڑنی ہیں لیکن جان سے نہیں مارنا۔ دونوں تیار ہو گئے۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہتا تھا کہ اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے گا لیکن اُس نے بھولپن میں ایک نام بتا دیا۔ یہ ابوذر کا سالا تھا۔ میری ہنسی سے وہ چونک پڑا۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے اور مجھے ہر ایک بات بالکل صحیح بتا دے۔

"جوش میں آکر میں نے اپنے ایک ساتھی کا اشارہ دے دیا ہے" — اُس نے پریشان سے لہجے میں کہا — "آپ یہ سمجھ لیں کہ میں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔ میں ان دونوں دوستوں کی سزا خود لینا چاہتا ہوں۔"

"تم بات کرو مصطفیٰ!" — میں نے کہا — "ہو سکتا ہے میں تمہیں بھی سزا نہ ہونے دوں، شرط یہ ہے کہ مجھ سے کچھ چھپانا نہیں.... یہ بتاؤ کہ ابوذر کا سالا اُس کی پٹائی کے لئے کیوں تیار ہو گیا تھا؟"

"اُس کی بہن کا اُس نے جینا حرام کیا ہُوا تھا" — اُس نے کہا — "اُسے کہتا تھا کہ طلاق دے دوں گا۔ اُس کے سامنے شفیقہ کی تعریفیں کرتا تھا۔ اُس کے ساتھ لڑتا جھگڑتا تھا۔ اُس کے سُسر نے اُس کے ساتھ بات کی تو اُس نے اس بزرگ کی بے عزتی کر دی۔ لڑکی والے اپنی عزت کی خاطر چپ ہو گئے لیکن اُس کا چھوٹا سالا جو میری عمر کا ہے، میری طرح برداشت کا کمزور ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ بات کی کہ اسے شفیقہ کے گھر جانے سے روکنا ہے۔ اُس کا سالا سمجھتا تھا کہ ابوذر نے شفیقہ کو اپنے دماغ پر سوار کر لیا ہے اس لئے اپنی بیوی اُسے بُری لگنے لگی ہے....

"اُس کا سالا تو اُسے ختم کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا لیکن میں نے ابھی کچھ اور سوچا تھا۔ ہم موقع دیکھتے رہے جو تین چار دنوں بعد ملا۔ ہم نے ایک اور دوست کو ساتھ ملا لیا تھا۔ ابوذر کا سالا اُس کے گھر اپنی بہن کے پاس گیا تو ابوذر گھر نہیں تھا۔ بہن نے بتایا کہ ابوذر فلاں گاؤں گیا ہے، مزارعوں سے

رقم لینی ہے۔ بہن نے یہ بھی بتایا کہ وہ شام کے بعد آئے گا۔ اُس نے کہا تھا آج وہ رقم لے کر ہی آئے گا چاہے آدھی رات ہو جائے....

"اُس کا سالا دوڑتا میرے پاس آیا اور مجھے یہ خوشخبری سنائی۔ ہم تینوں رات کا اندھیرا گہرا ہونے پر اُس راستے کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے جو راستہ شہر کو آتا ہے۔ آدھی رات ہونے کو آگئی تو ہم مایوس ہو گئے۔ وہ شاید گاؤں میں ہی رُک گیا تھا یا کسی اور راستے سے آیا اور اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ ہم وہاں سے اُٹھنے لگے تو وہ آگیا۔ چاندنی رات میں ہم نے اُسے پہچان لیا۔ وہ گنگناتا آ رہا تھا۔ ہم نے چہرے بڑے رومالوں سے چھپاتے ہوئے تھے....

"ہم تینوں گھات سے اُٹھے۔ میں نے اور میرے دوست نے اُس کے سامنے آ کر پیٹ میں گھونسے مارے۔ اُس کے سالے کے ہاتھ میں ڈنڈہ تھا۔ اُس کی پگڑی گر پڑی تھی۔ سالے نے اُس کے سر پر دو ڈنڈے مارے۔ اُس کے گرتے گرتے ہم نے اُسے گھونسوں سے بہت ہی پیٹا۔ اُس کے سالے کو بھی میں نے کہا کہ ڈنڈہ اور نہ مارے۔ پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔"

"کیا تم نے یہ الفاظ کہے تھے" — میں نے پوچھا — "کہ اب شفیقہ کے گھر جاؤ گے؟"

"یہی تو کہنا تھا" — مصطفےٰ نے جواب دیا — "میں نے یہ الفاظ ضرور کہے تھے.... میں اس بات پر حیران ہوں کہ اُس نے میری آواز پہچان لی ہو گی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُسے شفیقہ کے گھر جانے سے منع کرنے والا میں ہی تھا پھر اُس نے مجھے پکڑوایا کیوں نہیں؟"

"اُسی نے تمہارا نام لیا ہے" — میں نے کہا — "لیکن نام آج لیا ہے۔"

"وہ شاید اس لئے میرا نام نہیں لیتا تھا کہ اُس کی بدمعاشی کا پردہ اُٹھ جائے گا" — اُس نے کہا — "میرا بیان اتنا ہی ہے۔ اب مجھ سے سُنیں کہ میں نے اپنے باپ پر کیوں شک کیا ہے کہ شفیقہ کو اُس نے اغوا کروایا ہے۔"

جب پیار نے کروٹ بدلی

میں نے اُس سے اس واردات کے متعلق چند اور سوال کئے اور اُسے کہا کہ اب شفیقہ کی گمشدگی کے متعلق جو کہنا چاہتا ہے کہے۔

"آپ مجھے شریف آدمی نہیں سمجھیں گے" — اُس نے کہا — "لیکن خدا کو تو حقیقت معلوم ہے۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں جوان ہو گیا تو بھی شفیقہ کے پاس جا کر میں اپنے آپ کو بچہ سمجھنے لگتا تھا۔ میرے باپ نے اچانک میری شادی طے کر دی جو میں نے قبول کر لی۔ لڑکی خوبصورت ہے اور اُس میں ساری خوبیاں ہیں۔ میری شادی کی جتنی خوشی میری بہنوں کو تھی اتنی ہی شفیقہ کو ہوتی، لیکن میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک مہینے سے زیادہ خوش نہ رہ سکا۔ آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے بیوی میں کیا خرابی دیکھ لی تھی تو میں آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔ میرا دل اس لڑکی سے اُکھڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایسی خرابی پیدا ہو گئی کہ شفیقہ کے متعلق میری نظریں بدل گئیں....

"آپ میری اس تبدیلی کو غلط سمجھیں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری نیّت خراب ہو گئی تھی .... یہ بات نہیں تھی۔ میں اُسے پھر بھی پاک عورت سمجھتا رہا لیکن تبدیلی یہ آئی کہ آسمان سے حُور اُتر آئے تو وہ بھی مجھے خوش نہیں رکھ سکے گی۔ میں صرف شفیقہ کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا۔ میں جب اپنی اتنی خوبصورت اور نوجوان بیوی کے پاس ہوتا تھا تو میں ایسا محسوس کرتا تھا جیسے اس لڑکی نے مجھ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے اور میں شفیقہ کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے ان خیالات کو دبانے کی بہت کوشش کی لیکن میں دبا نہ سکا۔"

یہ نوجوان لڑکا اپنی اس تبدیلی کو جو اُس میں پیدا ہو گئی تھی دبا سکتا ہی نہیں تھا۔ میں خود ہی اُس کی اس تبدیلی اور اُس کی اس کیفیت کو بیان کروں تو آپ [illegible] طرح سمجھ سکیں گے۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا

کہ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ وہ اس لئے بھی جھجک اور جھینپ کر بولتا تھا کہ میں یہ سمجھوں گا کہ جو عورت اُسے ماں کا پیار دیتی تھی اُسے وہ بُری نظر سے دیکھنے لگا۔

یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس کی لپیٹ میں وہ آگیا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ نفسیات کا بھی کچھ مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس علم میں مجھے دلچسپی رہی۔ میرے پاس زیادہ تر ملزم وہ آتے تھے جو نفسیاتی مریض تھے۔ مشکل یہ ہے کہ حوالات اور جیل خانہ ذہنی امراض کے ہسپتال نہیں ہوتے۔ وہاں قانون چلتا ہے اور قانون کسی کی نفسیاتی کیفیت کو نہیں دیکھتا سوائے اس کے کہ ملزم پاگل ہو اور کورٹ میں ڈاکٹر ثابت کر دیں کہ یہ پاگل ہے۔ یہ ثابت ہونے کی صورت میں ملزم کو جیل خانے کی بجائے علاج کے لئے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے۔

نفسیات کی سُوجھ بُوجھ رکھنے والے اس معاملے کو سمجھ سکتے ہیں کہ مصطفیٰ نے شفیقہ کو ماں کا نعم البدل سمجھ لیا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایک جوان اور خوبصورت عورت ہے اور وہ خود بھی جوان ہے لیکن اُس کی شادی نوجوان لڑکی کے ساتھ ہوتی تو اُس کی فطرت کا ایک اور دروازہ کُھل گیا۔ نفسیات کا علم کہتا ہے کہ ہر عورت کے اندر باپ کا اور ہر مرد کے اندر ماں کا پیار زیادہ ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کے معاملے میں یُوں ہُوا کہ وہ اس نفسیاتی مسئلے کو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس احساس کو جو اُس کی فطرت کے عین مطابق تھا، دبا بھی نہیں دبا سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ پیدا ہو گئی کہ شفیقہ جو اُس سے دس سال بڑی تھی ابھی جوان تھی۔ مصطفیٰ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک نفسیاتی معمہ ہے۔ وہ اس کا اظہار یوں کرنے لگا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر شفیقہ کے ساتھ شادی کرے گا۔

پہلے تو وہ اپنی اس تبدیلی کو سمجھ ہی نہ سکا۔ اُس کا لاشعوری طور پر اظہار یوں ہوتا رہا کہ اپنی بیوی سے وہ متنفر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی بیوی تنگ آکر اپنے باپ کے ہاں جا بیٹھی جب شفیقہ بیوہ ہو گئی تو مصطفیٰ نے اپنی بہن سے

کہا کہ وہ شفیقہ کے ساتھ شادی کرے گا۔

مصطفیٰ نے مجھے بتایا کہ بہن نے جب یہ سُنا تو وہ اتنی حیران ہوئی کہ کچھ دیر بول ہی نہ سکی۔ مصطفیٰ نے یہ ضد شروع کر دی کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا اور شفیقہ کے ساتھ شادی کرے گا۔ مصطفیٰ کی دو بہنیں تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ کو بتانے کی بجائے مصطفیٰ کو سمجھایا کہ وہ کیا کفر بک رہا ہے۔ شفیقہ تو اُسے اپنا بچہ سمجھتی ہے۔ مصطفیٰ انہیں یہ یقین دلاتا تھا کہ شفیقہ کے ساتھ اُس کے تعلقات پاکیزہ ہیں اور وہ غلط نہ سمجھیں، لیکن یہ بات ایسی تھی کہ سب اسے غلط ہی سمجھتے تھے۔ ہر کوئی نفسیاتی معاملات کو نہیں سمجھ سکتا۔ لوگ تو کسی پاگل کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ جان بوجھ کر پاگل بنا ہُوا ہے

آخر باپ کو پتہ چل گیا۔ پھر بھائی کو پتہ چلا۔ دونوں نے پہلے تو اسے زبانی سمجھایا جب اُس کی ضد بڑھی تو دونوں سے اُس نے مار کھائی لیکن مصطفیٰ اپنی ضد سے نہ ہٹا۔ اُس میں یہ تبدیلی اتنی تیزی سے آرہی تھی کہ چند دنوں میں ہی اُس نے اپنے خاندان اور اپنے سُسرال کو ہلا کے رکھ دیا۔

مصطفیٰ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اُس نے شفیقہ کو بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔ شفیقہ نے اُسے سمجھایا کہ وہ اُس سے دس سال بڑی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بے گناہ لڑکی کی بد دعائیں نہیں لینا چاہتی۔ شفیقہ نے بُرا نہیں منایا تھا۔ وہ اسے پیار سے سمجھاتی رہی۔

اسی دوران ابوذر اور مصطفیٰ کا تصادم ہو گیا۔ اپنے گھر والوں کو تو مصطفیٰ نے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ پھر یہ واردات ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی شفیقہ لاپتہ ہو گئی۔

"میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ شفیقہ کو دل سے نکالو"— مصطفیٰ نے کہا —"اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو شفیقہ کو ڈھونڈتے پھرو گے.... میں اسے خالی دھمکی سمجھتا رہا۔ ایک روز میرے سُسر نے مجھے راستے میں روک

لیا اور کہنے لگا کہ یہ بدمعاش عورت عیش موج کرنے کے لئے یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا باپ بھی بے غیرت ہے اور اس کا سُسر بھی۔ تم انسان بن جاؤ۔ تم اُس کے جال میں آتے ہُوتے ہو ورنہ ہم یہ کانٹا ہی نکال پھینکیں گے۔"

مصطفٰے نے مجھے اپنے باپ، اپنے سُسر اور اپنے بڑے بھائی کے متعلق اتنی زیادہ باتیں بتائیں کہ مجھے شک ہوگیا کہ شفیقہ کو اُنہوں نے ہی کانٹے کی طرح نکال پھینکا ہے۔ ان لوگوں کے پاس اس مسئلے کا یہی ایک حل تھا۔ ان کا نوجوان لڑکا اپنے آپ کو اور اپنی نوجوان بیوی کو دوزخ میں ڈالے ہُوتے تھا۔

میں نے مصطفٰے کو باہر بیٹھنے کو کہا اور اُس کے باپ کو بُلایا۔ مصطفٰے کے بیان کے سوا میرے پاس کوئی ٹھوس شہادت تو تھی نہیں۔ میں اُس کے باپ کو کیا کہتا۔ میں نے پُوچھ گچھ کے کرتب دکھاتے لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ اُس جیسا معزز آدمی ایک بے چاری بیوہ کو کیوں اغوا کراتا۔ مصطفٰے کے سُسر کو بلایا اور اُس کے سامنے بھی یہی الزام رکھا کہ اُس نے شفیقہ کو اغوا کرایا ہے۔

اُس نے بھی وہی جواب دیا جو مصطفٰے کا باپ دے چکا تھا۔ مَیں اُنہیں کہتا تھا کہ اپنے لڑکے کو شفیقہ کے جال سے نکالنے کے لئے اُنہوں نے یہ حرکت کی ہے لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔

منوانے کا طریقہ میں جانتا تھا۔ کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ وہ معزز آدمی ہے اُسے پولیس کے طریقۂ تفتیش سے اور قانون سے نجات نہیں مل سکتی۔

"دیکھیں جناب!" — مَیں نے ان دونوں کو اکٹھا کھڑا کر کے کہا — "مَیں آپ کو تھوڑی مہلت دیتا ہوں۔ یہ بھی اس لئے کہ آپ کی عزت محفوظ رہے۔ باہر جا کر بیٹھیں۔ آپس میں بات کر لیں اور مجھے صحیح بتائیں۔ میں آپ کو تھانے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ اگر آپ شرافت سے عورت واپس کر دیتے ہیں تو میں اُس کے باپ اور سُسر کو منوا لوں گا کہ وہ اپنی رپورٹ واپس لے لیں اور اگر لاپتہ عورت کا سراغ میں نے خود لگایا اور یہ جُرم آپ کا نکلا تو پھر

قانون میں جتنی سزا لکھی ہوتی ہے وہ دلاؤں گا۔"

"دیکھو جی، اس لڑکے نے ہمیں کتنا ذلیل کر دیا ہے" — مصطفٰے کے باپ نے کہا — "یہ ہمارے خلاف کارروائیاں کراتا پھرتا ہے۔ اس سے بہتر ہوتا کہ اس کی ماں کی موت اسے دُنیا سے اُٹھا لے جاتی۔"

"تھانے میں جذباتی باتیں نہیں چلا کرتیں جناب!" — میں نے کہا — "اپنی حیثیت کو سوچیں اور اپنی عزت سچ بول کر بچائیں۔"

میں نے انہیں باہر نکال کر مصطفٰے کو بلایا اور اُسے بتایا کہ اُس کے دونوں بزرگ تو مان ہی نہیں رہے۔ مصطفٰے الیقین کے ساتھ کہتا تھا کہ یہ ان دونوں کی بدمعاشی ہے۔

"ایک بات بتاؤ" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے کہا تھا کہ تم شفیقہ کے پیچھے چلے گئے تھے .... کہاں گئے تھے؟"

"مجھے پورا پورا یقین تھا کہ شفیقہ کو میرے باپ نے غائب کروایا ہے" — اُس نے جواب دیا — "مجھے شک ہُوا کہ اسے میرے باپ نے اپنے مربعوں پر بھیج دیا ہو گا جہاں اُسے یہ کہا جا رہا ہو گا کہ وہ میرے ساتھ تعلق توڑ لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے انہوں نے مروا ہی دیا ہو۔ مجھے جُوں ہی پتہ چلا کہ شفیقہ لاپتہ ہے تو میں گھر بتاتے بغیر مربعوں پر چلا گیا۔ میں نے مزارعوں کے گھروں میں جا کر دیکھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میں مایوس ہو کر واپس آگیا۔"

"کیا تمہارے باپ یا سُسر کے ہاتھ میں کوئی ایسے بدمعاش ہیں جن سے انہوں نے شفیقہ کو اغوا کرایا ہو گا؟"

اُس نے مجھے تین نام بتاتے۔ ان میں ایک سزا یافتہ تھا۔ باقی دو اچھے خاصے بدمعاش تھے اور وہ مصطفٰے کے باپ سے بہت مانوس تھے یعنی اُن کی دوستی تھی۔ میں نے ان تینوں کو تھانے طلب کرنے کی سوچی لیکن ایک اور کام کے لئے تفتیش الگ رکھ دی۔

"تیرے باپ کی ...."

اگلے روز صبح کے نو بجے کا وقت ہوگا کہ اس ڈرامے کے ایک اور منظر سے پردہ اُٹھا۔ یہ اللہ کی خاص کرم نوازی تھی۔ میرے تھانے کے ساتھ والے دیہاتی علاقے کے تھانے سے ٹیلیفون آیا۔ ایک سکھ سب انسپکٹر جسونت سنگھ بول رہا تھا۔

"اوئے ملکا!" — اُس نے کہا — "تیرے پاس کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ ہے؟"

"ہے یار، ہے" — میں نے بے صبری سے کہا — "نام بول، نام بول کیا ہے اس کا۔"

"اپنا نام شفیقہ بتاتی ہے" — اُس نے کہا۔

"ہاں جسونتے!" — میں نے خوشی سے پھٹتے ہوئے کہا — "وہ میری ہے۔"

"تیرے باپ کی ہے" — جسونت سنگھ نے بڑی بے تکلفی سے کہا — "وہ اپنے باپ کا نام اور خاوند کا نام کچھ اور بتاتی ہے اور تو کہتا ہے یہ میری ہے.... چل آجا۔ لے جا اسے۔"

میں نے فون بند کیا اور اُسی وقت اے ایس آئی سے کہا کہ وہ شفیقہ کو وہاں سے لانے کا فوری بندوبست کرے۔ وہ تھانہ تقریباً پندرہ میل دُور تھا۔ دیہاتی علاقہ تھا۔ وہاں تک تانگہ ہی جا سکتا تھا۔ اے ایس آئی اپنے ساتھ دو کانسٹیبلوں کو لے کر روانہ ہوگیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے ایک اچھی خاصی خوبصورت عورت میرے سامنے کھڑی کی گئی۔ وہ شفیقہ تھی۔

"کیا تمہیں زبردستی اغوا کیا گیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"دھوکے میں" — اُس نے جواب دیا — "ایک عورت جو مصطفےٰ کے

گھر کام کرتی ہے۔ رات کو میرے پاس آئی۔ وہ کہنے لگی کہ مصطفےٰ کو کچھ ہوگیا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہُوا ہے تو اُس نے بتایا کہ بیٹھے بیٹھے اُس کا جسم اکڑ گیا اور وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔ میں دوڑ پڑی۔ یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ عورت پیچھے رہ گئی۔ میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ گلی کی نکڑ سے مُڑی۔ اچانک دو آدمی میرے آگے آگئے۔ ایک نے مجھے بہن کہہ کر بلایا اور پوچھا، کہاں جا رہی ہو۔ میں ان دونوں کو نہیں جانتی تھی۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر آگے چلنے لگی تو دوسرا بولا کہ مصطفےٰ کی خبر سُن کر تو نہیں جا رہیں۔ میں نے کہا کہ اُسی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ اُس نے کہا کہ مصطفےٰ کی حالت تو بہت ہی خراب ہے۔ اُسے ابھی ابھی چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے گئے ہیں اور ہم بھی اُدھر ہی جا رہے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اس کے والد صاحب کے یار دوست ہیں....

"میں اس لڑکے کی خاطر ایسی پاگل ہوئی کہ مصطفےٰ کے گھر کی طرف جانے کی بجائے اسی گلی میں سیدھی آگے چلی گئی۔ وہاں سے سڑک پار کر کے ہسپتال پہنچنا تھا۔ وہ دونوں آدمی تیز تیز چلتے میرے آگے آگے کچھ دُور چلے گئے۔ میں جب گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچی تو وہاں ایک تانگہ کھڑا تھا۔ وہ دونوں آدمی رُک گئے۔ رات کا وقت تھا، سڑک سنسان تھی۔ دونوں آدمیوں نے چاقو نکال لئے اور چاقوؤں کی نوکیں میرے پہلوؤں کے ساتھ لگا کر کہا کہ مصطفےٰ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، اپنے گھر سویا ہُوا ہے اور تم خاموشی سے تانگے پر بیٹھ جاؤ....

"میری تو زبان ہی بند ہوگئی۔ اتنے میں تانگے والے نے پیچھے سے کپڑا پھینک کر میرا مُنہ باندھ دیا۔ انہوں نے مجھے اُٹھا کر تانگے میں ڈالا اور میں بتا نہیں سکتی کہ تانگہ کس طرف چل پڑا۔ راستے میں ان دونوں نے مجھے کہا کہ میرے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوگی اور مجھے کسی بُری نیت سے اغوا نہیں کیا جا رہا۔ میں تو بول ہی نہیں سکتی تھی۔ بہت دیر تانگہ چلتا رہا۔ میں یہ محسوس

کر سکی کہ تانگہ سڑک پر نہیں جا رہا بلکہ یہ دیہاتی پگڈنڈی ہے۔"

خوف کے مارے شفیقہ کا خون خشک ہو گیا۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اُسے کسی بُری نیت سے اغوا نہیں کیا جا رہا۔ وہ سوچتی رہی کہ کون ایسا شخص ہے جس نے اُس پر یہ وار کیا ہے۔ اُس کے خیال میں بار بار ابوذر آتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ ابوذر پر اُسے اس لئے شک تھا کہ ابوذر اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور شفیقہ نے اُسے بہت بُری طرح دُھتکار دیا تھا۔

شفیقہ کے اندازے کے مطابق تانگہ ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ چلتا رہا۔ تانگہ رُکا۔ اُن لوگوں نے شفیقہ کو اُتارا اور سہارا دے کر ایک مکان میں لے گئے۔ جو کپڑا اُس کے مُنہ پر باندھا گیا تھا اُس سے اُس کی آنکھیں بھی ڈھک گئی تھیں۔ جب اُس کے مُنہ سے کپڑا اُتارا گیا تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مٹی کا ایک دیا جل رہا تھا۔ یہ کچے مکان کا کمرہ تھا۔ دو چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں جن پر بستر تھے۔ دروازہ بند تھا اور دو آدمی وہاں موجود تھے۔ میں یہ سُن کر حیران ہُوا کہ ان دونوں نے اپنی شناخت کو چھپانے کے لئے اپنے مُنہ ڈھانپے ہُوئے نہیں تھے۔ شفیقہ اُنہیں نہیں پہچانتی تھی۔

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ شفیقہ کی کیا حالت ہوتی ہو گی۔ وہ اگر بے ہوش نہیں ہوئی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ہمت والی عورت تھی۔ اُسے تو خوف سے مر جانا چاہیئے تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ وہ لڑ نہیں سکتی تھی۔ اُس نے کمرے میں ہر طرف دیکھا کہ کلہاڑی، لاٹھی، ڈنڈہ یا پتھر نظر آجاتے تو اُٹھا کر اپنا آپ بچاتے۔ وہ لڑ کر مرنے کے لئے تیار ہو گئی لیکن کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔

"مجھے چھوڑ دو یا مجھے قتل کر دو" — اُس نے ان آدمیوں سے کہا — "شرم کرو۔ لعنت ہے تمہاری مردانگی پر۔ تم دو مرد ہو اور میں اکیلی عورت ہوں۔"

"ہم نے تجھے شہر میں کہہ دیا تھا کہ تیری عزت پر یہاں کوئی ہاتھ نہیں ڈالے گا" — ایک آدمی نے کہا — "تم بیوہ ہو اور ہمارے پاس امانت ہو۔"

"پھر مجھے کیوں لے آئے ہو؟" — شفیقہ نے پوچھا — "کیا میرے باپ سے میرے عوض زر بیہ لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں!" — اُس آدمی نے کہا — "صرف یہ کام کرو کہ مصطفٰے کے ساتھ تعلق توڑ لو۔ وعدہ کرو کہ اُس کے ساتھ تمہارا تعلق ختم ہو گیا ہے پھر ہم تمہیں تمہاری آنکھیں باندھ کر تمہارے گاؤں کے باہر چھوڑ آئیں گے۔ تم اپنے گھر چلی جانا۔ اس کے بعد تم شہر نہیں جاؤ گی۔ اگر گئیں اور مصطفٰے سے ملیں تو قتل ہو جاؤ گی۔ تم نے دیکھ لیا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ شفیقہ پر اس شرط کا اثر بالکل اُلٹا ہُوا۔

"میں یہ بھول ہی گئی کہ میرا انجام کیا ہو گا" — شفیقہ نے مجھے سُنایا — "میں یہ سمجھی کہ مجھے ابوذر نے اغوا کرایا ہے۔ میں اپنے گاؤں میں چلی جاؤں گی اور مصطفٰے کے ساتھ ملاقاتیں ختم ہو جائیں گی پھر ابوذر میرے ماں باپ سے میرا رشتہ لے گا۔ مجھے اُسی پر شک تھا۔ میں نے اُس کی ایک بار بے عزتی کر دی تھی۔ ان دو آدمیوں نے میرے آگے یہ شرط رکھی کہ میں مصطفٰے سے تعلق توڑ لوں اور شہر کبھی نہ جاؤں تو غصّے سے میرا جسم کانپنے لگا۔ میرے دل کا حال ایسا ہو گیا جیسے ماں سے کہا جا رہا ہو کہ وہ اپنے چھوٹے سے بچے سے ملنا چھوڑ دے۔ غصّہ تو مجھے ابوذر پر تھا.... مَیں نے انہیں کہا کہ مجھے قتل کر دو تمہاری شرط نہیں مانوں گی۔ جاؤ، ابوذر کو میرے سامنے لے آؤ۔ میں اُس کے مُنہ پر تھوکوں گی۔"

"ابوذر کا اس معاملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں" — شفیقہ کو اغوا کرنے والے ایک آدمی نے کہا — "وہ تو ہسپتال پڑا ہُوا ہے۔"

"پھر تم کیا لگتے ہو مصطفٰے کے؟" — شفیقہ نے پوچھا — "میرے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تم اُن کی بات کرو جن کا مصطفیٰ کچھ لگتا ہے" — ایک آدمی نے کہا۔

"او بھائی!" — اغوا کرنے والے دوسرے آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا — "اِسے صحیح بات بتا دو۔ انہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

"دیکھ بی بی!" — شفیقہ کو انہوں نے بتایا — "تمہیں مصطفیٰ کے باپ اور سُسر نے گھر سے اُٹھوایا ہے۔ وجہ تم جانتی ہو۔ تم نے مصطفیٰ پر ایسا جادو چلا رکھا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔ وہ تمہیں اُس کے سامنے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اگر تم یہاں سے نکل کر تھانے چلی جاؤ گی اور مصطفیٰ کے باپ اور سُسر کا نام لو گی تو اُنہیں کوئی نہیں پکڑے گا۔ انہوں نے پہلے ہی مشہور کر رکھا ہے کہ تم اچھے چال چلن کی عورت نہیں ہو۔ اب وہ ہر کسی کو بتا رہے ہوں گے کہ شفیقہ اپنے کسی آشنا کے پاس چلی گئی ہے۔"

شفیقہ کا غصہ بڑھ گیا۔ اُس نے کہا کہ اب جو جی میں آتے کر لو، میں مصطفیٰ کے ساتھ تعلق جیسا بھی ہے، نہیں توڑوں گی۔

وہ اُسے سمجھاتے رہے لیکن وہ نہ مانی۔ انہوں نے باہر جا کر دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔ شفیقہ کمرے میں بند ہو گئی۔ کمرے کا بھی ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی نہیں تھی۔ وہ رات کو بند رہی۔ صبح دروازہ کھُلا اور ایک عورت نے اُسے پراٹھا اور دودھ دیا۔ شفیقہ نے اُس سے پوچھا کہ یہ کون سا گاؤں اور یہ کس کا گھر ہے۔ عورت نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔

وہ اتنے دن اس کمرے میں بند رہی۔ ان دو میں سے ایک آدمی دو تین بار اس کے پاس آیا اور اُسے سمجھاتا رہا کہ وہ مصطفیٰ کو دماغ سے نکال دے۔ شفیقہ نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی اب کچھ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ شفیقہ کو سوائے قید کے اور کوئی پریشانی یا تکلیف نہ دی گئی۔ دروازہ باہر سے بند رہتا تھا۔

جب تک شفیقہ میرے سامنے ہے!

اس عورت کی قید کی روئیداد دلچسپ ہے لیکن میں ایک ایک منٹ کی تفصیل نہیں سُنا سکتا۔ یہ تو پوری کتاب پر پھیل جانے والی کہانی ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ وہ کردار کی بڑی پکّی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سچ بول رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے اغوا کرنے والوں کی یہ شرط نہ مانی کہ وہ مصطفیٰ سے تعلق توڑ لے گی۔

یہاں میں مصطفیٰ کے باپ اور سُسر کی حماقت کا ذکر کر دوں۔ یہ لوگ درمیانہ درجے کے لینڈ لارڈ تھے۔ یہ نسل پاکستان میں موجود ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا۔ مصطفیٰ نے انہیں اتنا زیادہ پریشان کر دیا تھا کہ وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے پر تیار ہو گئے کہ ایک عورت کو کرائے کے مجرموں سے اغوا کرا دیا۔ یہ انہوں نے اسی خوش فہمی میں خطرہ مول لیا تھا کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں مگر ان میں اتنی عقل نہیں تھی کہ آگے کی بھی سوچ لیتے کہ شفیقہ کا کیا بنائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ڈرا دھمکا کر اُسے اُس کے گاؤں چھوڑ آئیں گے۔

جس کا کردار اور ایمان پکّا ہو اُس کی مدد خدا کرتا ہے۔ ایک رات شفیقہ کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہ ہُوا۔ اُسے قید میں رکھنے والوں کو شاید اُس پر اعتبار آ گیا تھا کہ انہوں نے دروازے کے باہر والی زنجیر نہ چڑھائی یا زنجیر چڑھانا بھُول گئے تھے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے کا وقت ہو گا۔ شفیقہ اُٹھی اور آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا اور کواڑ کو کھینچا۔ کواڑ کھُل گیا۔ اُس نے دیکھا، صحن میں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر گھر والے سوتے ہوتے تھے۔ تینوں کے اوپر کھیس تھے۔

شفیقہ نے دروازے میں کھڑے رہ کر صحن اور دیواروں کو دیکھا۔ پورے

چاند کی چاندنی اُسے بہت مدد دے رہی تھی۔ دیوار مکان کی طرح کچی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چبوترا سا تھا جس میں چھوٹا سا تنور لگا ہوا تھا۔ اس پر کھڑے ہو کر دیوار پھاندی جا سکتی تھی۔ شفیقہ دبے پاؤں باہر گئی اور تنور کے چبوترے پر چڑھ گئی۔ اُس کا ہاتھ دیوار کے اُوپر پہنچ گیا۔ وہ اُوپر چڑھنے لگی تو پاؤں سے دیوار کی لپائی کا ایک ٹکڑا دیوار سے الگ ہو کر گر پڑا۔ اُس کی آواز سے گھر والے جاگ اُٹھے۔

"ٹھہر او تے!" — شفیقہ کو آواز سنائی دی۔

اُس نے پیچھے نہ دیکھا۔ دیوار پر چڑھ کر باہر کو کُود گئی۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ ایک آدمی اندر سے دیوار پر آ چکا تھا۔ شفیقہ نے شور مچانا شروع کر دیا اور ایک طرف دوڑ پڑی۔ اُس نے چیخیں مارنی شروع کر دیں اور چلّاتی جا رہی تھی — "لوگو، باہر نکلو۔ مجھے مارتے ہیں۔ لوگو..... باہر نکلو۔"

گاؤں کے کئی آدمی جاگ کر نکل آئے۔ شفیقہ رُک گئی۔

"یہ مجھے اغوا کر کے لاتے تھے" — اُس نے اُس گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا — "میں بھاگ آئی ہوں۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔"

نمبردار بھی آگیا۔ لوگوں نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ وہ کہتے تھے کہ شریفوں کا گاؤں ہے۔ ان بدمعاشوں کے سر کھول دو۔ اغوا کرنے والے زیادہ اثر و رسوخ والے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اکثر پیشہ ور مجرم نمبردار کو خوش رکھتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ نمبردار ان مجرموں کا دوست ہی ہوتا لیکن شفیقہ لوگوں کے سامنے آگئی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے کہ ان بدمعاشوں کو پکڑو، اس لئے نمبردار مجبور ہو گیا۔ اُس نے اُس گھر میں جا کر دیکھا۔ وہ آدمی بھاگ گئے تھے۔

شفیقہ کو تھانے لے گئے جو وہاں سے تین ساڑھے تین میل دُور تھا۔ نمبردار نے تھانیدار کو اُن آدمیوں کے نام بتائے جن کا وہ گھر تھا۔ اس طرح شفیقہ میرے پاس پہنچ گئی۔ سب انسپکٹر جسونت سنگھ نے مجھے کہا تھا کہ وہ ان آدمیوں کو پکڑ لے گا۔

شفیقہ کا بیان جاری تھا۔ میں نے مصطفٰے کے باپ اور اُس کے سُسر کو پابند کرنے کے لئے شفیقہ کے بیان کو روک دیا اور میں باہر نکلا۔ وہ دونوں باہر موجود تھے۔ میں نے دونوں کو بلایا اور انہیں اس حکم کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا کہ الگ الگ اپنی حراست میں رکھے۔ ان کے ساتھ کوئی آدمی بات نہ کرے نہ ہی یہ آپس میں کوئی بات کر سکیں۔

شفیقہ کا بیان تو دراصل ختم ہو چکا تھا لیکن میں اُس سے پس منظر کی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اگر مصطفٰے کے ساتھ اُس کے تعلقات میاں بیوی والے ہی تھے تو یہ پولیس کی نظر میں کوئی جرم نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اُس سے مصطفٰے کے ساتھ اور ابوذر کے ساتھ تعلقات کے بارے میں پوچھا۔

"مصطفٰے مجھے اپنے بچوں سے زیادہ پیارا لگتا ہے" — شفیقہ نے کہا — "میرا پہلا بچہ پیدا ہو کر مر گیا تو مصطفٰے جو اُس وقت دس گیارہ سال کا تھا مجھے بہت ہی پیارا لگا۔ پھر اُس کی ماں مر گئی اور میں نے اُسے روتے دیکھا تو میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آتی تھی۔ اپنے پاس بھی سُلاتی تھی اور میں اس طرح محسوس کرنے لگی جیسے میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ اُس نے بھی مجھے اپنی ماں سمجھ لیا۔"

شفیقہ نے اپنے بیان کے اس حصے کو زیادہ ہی لمبا کر دیا۔ شاید اس لئے کہ اُسے ڈر تھا کہ میں یہ شک نہ کروں کہ مصطفٰے کے ساتھ اس کے تعلقات قابلِ اعتراض تھے۔ میں آپ کو اُس کے بیان کا صرف جذباتی اور نفسیاتی پہلو سُنا رہا ہوں۔

"مصطفٰے جوان ہو گیا" — شفیقہ نے کہا — "پھر بھی میں اسے بچہ ہی سمجھتی رہی۔ مجھے ایک اور صدمہ ہُوا تھا۔ ایک بچی پیدا ہوئی اور وہ بھی مر گئی تھی مجھے وہم ہو گیا کہ میرے لئے بچوں کا پیار ہے ہی نہیں۔ میں نے اپنی ممتا مصطفٰے کو دے دی۔ اس نے بھی جیسے محسوس ہی نہ کیا کہ یہ جوان ہو گیا ہے۔ ہمارے درمیان خدا کی ذات تھی۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا کہ میں ایک جوان آدمی سے پیار

محبت کر رہی ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مصطفےٰ کو بھی کبھی ایسا خیال نہیں آیا تھا....

"اس کی شادی ہوئی تو مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی اس کی ماں کو ہوئی مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ اسے بڑی خوبصورت لڑکی ملی لیکن یہ لڑکا کچھ دنوں بعد ہی اپنی بیوی سے تنگ آگیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کے خلاف باتیں کرنی شروع کر دیں۔ میں نے خود دیکھا۔ اس کی بہنوں سے بھی پوچھا۔ مجھے اس لڑکی میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اسے معلوم نہیں کیا خرابیاں نظر آ رہی تھیں کہ اُس کے ساتھ اس نے بول چال ہی بند کر دی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ لڑکی اپنے گھر جا بیٹھی۔"

"شفیقہ!" —— میں نے کہا —— "میں اگر کہوں کہ مجھے تمہاری ان باتوں پر شک ہے تو کیا کہو گی؟.... شک یہ ہے کہ تمہیں مصطفےٰ کی شادی کا افسوس ہوا تھا۔"

"آپ حاکم ہیں" —— اُس نے بلا جھجک کہا —— "آپ اس بات کو سچ مانیں گے جو آپ کے دماغ میں آئے گی، لیکن آپ کا قانون، قرآن مجید سے اُوپر نہیں۔ قرآن مجید کے اُوپر خدا کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے سر پر قرآن مجید رکھ دیں۔ پھر میں بات کروں گی۔ میں اس سے بڑا اور کیا ثبوت دے سکتی ہوں۔"

جھوٹے اور سچے میں فرق معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ تھانیداروں کو یہی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ اس فرق کو پہچان لیتے ہیں۔ قرآن کی قسمیں تو ہر ملزم کھاتا ہے۔ شفیقہ کے متعلق مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں وہ جرح نہیں لکھ رہا جو میں نے اُس پر کی تھی۔

"ایک روز مصطفےٰ آیا اور رو پڑا" —— شفیقہ نے بیان دیتے ہوئے کہا —— "میں بہت پریشان ہوئی اور اسے کہا کہ اپنی بیوی کو گھر لے آؤ۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بیوی میں کوئی ایسا نقص نہیں تھا کہ یہ اُسے گھر بٹھا دیتا۔ اس کی بہنیں بھی بہت پریشان تھیں۔ میں نے جب اسے کہا کہ اپنی بیوی کو گھر لے

آؤ تو اس نے کہا کہ اب تم میرے گھر آؤ گی۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں تو سُن ہو کے رہ گئی۔ اپنے آپ کو سنبھال کر میں نے اسے سمجھانا بجھانا شروع کر دیا لیکن یہ تو فیصلہ کر چکا تھا....

"اگر مصطفےٰ کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو اور بات تھی۔ اُس وقت میرا خاوند فوت ہو چکا تھا اسی لئے مصطفےٰ نے مجھے شادی کے لئے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میری بات سمجھ گیا ہے لیکن اس نے اپنے گھر مصیبت کھڑی کر دی۔ اس کی بہنوں نے مجھے بتایا کہ یہ میرے ساتھ شادی کرنے کی ضد کر رہا ہے۔ اس کا باپ اچھا سا آدمی ہے۔ ایک روز میں ان کے گھر کو ہی جا رہی تھی کہ وہ راستے میں مل گیا۔ مجھے کہنے لگا کہ تم نے میرے بیٹے پر کیا تعویذ کر دیا ہے؟ تم اتنا بھی نہیں سوچتیں کہ وہ تم سے دس بارہ سال چھوٹا ہے اور تم اُسے کہتی ہو کہ آؤ شادی کر لیں....

"اگر میں عورت نہ ہوتی تو میں اس شخص کی پگڑی گلی میں اُتار دیتی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں آئندہ اُس کے گھر نہیں آؤں گی اور وہ اپنے بیٹے کو میرے گھر نہ آنے دے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہہ دیا کہ اُس نے جو بکواس کی ہے، اگر میں یہ اپنے سُسر اور اُس کے بیٹوں کو بتا دوں تو خون خرابہ ہو جائے۔ اُس نے مجھے رُعب دیا اور بڑی گھٹیا باتیں کیں۔ میں نے اس سے زیادہ گھٹیا باتیں سُنا دیں۔ میں نے یہ باتیں آہستہ آہستہ کہی تھیں تاکہ محلے والے نہ سُن لیں ورنہ وہیں اچھی خاصی لڑائی ہو جاتی۔ میں وہیں سے واپس آگئی۔ مصطفےٰ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے ساری بات سُنائی۔ یہ میری غلطی تھی۔ وہ غصے میں اُٹھا اور گھر چلا گیا۔ رات اُس کی ایک بہن میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ مصطفےٰ نے اپنے باپ کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی ہے اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک شفیقہ میرے سامنے ہے میں کسی اور کو قبول نہیں کروں گا۔ اس کے دو روز بعد میں اغوا ہو گئی۔"

ابوذر کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ اُس کے لئے ایک الگ مسئلہ بنا ہوا

تھا۔ شفیقہ نے کہا کہ اس شخص کا تو وہ نام ہی نہیں لینا چاہتی۔ کہتی تھی کہ ڈھیٹ اور گھٹیا آدمی ہے۔ شفیقہ نے اسے ایسے طریقے سے دُھتکارا تھا جو ایک غیرت مند آدمی کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ابوذر نے اُسے ایسی بات کہی تھی جو ایک قسم کی دھمکی تھی۔ اسی لئے شفیقہ کو یہ شک ہُوا تھا کہ اُسے ابوذر نے اغوا کرایا ہے۔ اُس نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ مصطفٰے کا باپ بھی اوچھا ہی ہے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا بڑا جرم کرنے پر بھی آجاتے گا۔

شفیقہ کو میں نے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور مصطفٰے کے باپ کو بلایا۔

"میرا خیال تھا کہ میں تمہاری عزت کروں گا" — میں نے کہا — "لیکن اب میں تمہیں 'آپ' بھی نہیں کہنا چاہتا۔ تم تو بہت بڑے مجرم ہو۔ اگر اپنی عزت بچانا چاہتے ہو تو فوراً اُن دو آدمیوں کے نام بتادو جن سے تم نے شفیقہ کو اغوا کرایا تھا۔"

"اگر میں کہوں کہ یہ الزام غلط ہے" — اُس نے کہا — "تو کیا آپ ثبوت پیش کریں گے؟"

"میں تمہیں باہر برآمدے میں کھڑا کر کے کانسٹیبلوں سے جُوتے مرواؤں گا" — میں نے کہا — "پھر ثبوت خود ہی پیش ہو جاتے گا .... تمہارے پاس مربعے ہیں اور روپیہ پیسہ بھی ہوگا لیکن قانون میرے پاس ہے جو تمہارے اس طرّے سے نہیں ڈرتا .... میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

میری زبان پر ایک خاص قسم کی گالی آئی تھی جو میں اس قسم کے خودساختہ معززین کو دیا کرتا تھا لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اللہ نے میری ہمیشہ مدد کی ہے۔ اس کیس میں تو ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اللہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ میں نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ سب انسپکٹر جسونت سنگھ سکھوں کی مخصوص بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ ویسے بھی وہ میرا دوست تھا۔

"اوملکا!" — اُس نے کہا — "تیرے ایک یار کو میں نے پکڑ

لیا ہے اور میرے دو تھپڑوں اور ایک گھونسے سے ہی اقبالی ہو گیا ہے۔ آاور لے جا اسے۔"

تھوڑی گپ شپ لگا کر میں نے مصطفٰے کے باپ کو بتایا کہ اُس کا ایک یار پکڑا گیا ہے اور وہ اقبالی ہو گیا ہے۔

"اب بتا معزّز آدمی!" — میں نے کہا۔

"میں نے کیا بتانا ہے جناب!" — اُس نے مُسکراتے ہوتے کہا — "آپ بتائیں۔"

"مَیں کیا بتاؤں؟"

"عزّت کا سوال ہے جناب!" — اُس نے کہا — "جو جناب بتائیں گے وہ دو منٹ میں حاضر ہوگا۔ اللہ نے بہت دیا ہے۔"

یہ لمبی باتیں ہیں۔ وہ رشوت پیش کر رہا تھا اور میں اُس سے منہ مانگی رشوت لے سکتا تھا۔ میں نے اُسے یہ جھانسہ دے کر کہ میں رشوت قبول کر لوں گا اُس سے بیان لے لیا۔ بیان دیتے دیتے اُس کے آنسو نکل آتے۔ کہنے لگا اُس کے بیٹے نے اُسے ذلیل اور رُسوا کر دیا ہے۔

مصطفٰے کے سُسر نے بھی بیان دے دیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی خاطر مصطفٰے کے باپ سے مل کر یہ طے کیا تھا کہ شفیقہ کو ہی اُٹھوا دیا جاتے۔ میں نے دونوں سے پوچھا تھا کہ اغوا کے بعد اُن کا کیا ارادہ تھا۔ مصطفٰے کے باپ نے تو کوئی اوچھا جواب نہیں دیا تھا، اُس کے سُسر نے کہا کہ وہ شفیقہ کو مروا ہی دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد کہانی کا جو حصّہ ہے وہ پولیس کی کارروائی کی رُوداد ہے۔ کراتے کا ایک ملزم پکڑا گیا تھا۔ اُس نے دوسرے کو بھی پکڑوا دیا۔ تانگے کا انتظام ان دونوں آدمیوں کا تھا۔ وہ قصبے میں تانگہ چلاتا تھا۔ رہنے والا ایک گاؤں کا تھا۔ اُسے بھی پکڑ لیا گیا۔ یہ تینوں کراتے کے ملزم تھے۔ مصطفٰے کے باپ اور سُسر کے خلاف ثابت کرنا کہ واردات انہوں نے کراتی ہے آسان نہیں تھا لیکن

مجھے یہ یقین ہوگیا تھا کہ واردات انہوں نے ہی کراتی ہے اور وہ اقبالی بھی ہو چکے تھے، میں نے اُن کے خلاف دوسری شہادت بھی تیار کر لی تھی۔

یہ مقدمہ تو تیار ہوگیا لیکن ابوذر پر مجھے بہت غصّہ تھا۔ اُس کا کردار آپ کو سُنا چکا ہوں۔ مَیں نے اُسے کہا کہ اُس پر جنہوں نے حملہ کیا تھا وہ میری حراست میں ہیں۔

"اگر تم چاہتے کہ انہیں سزا ہو تو ایک بات سوچ لو" —— میں نے ابوذر سے کہا —— "عدالت میں تمہیں بہت ذلیل ہونا پڑے گا۔ تمہارے مزارعے بھی پیش ہوں گے جو یہ بیان دیں گے کہ تم نے اُن کی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اُس عورت نے تمہیں دُھتکارا۔ پھر تم نے نمبردار کو ساتھ ملا کر اُس کو پھنسانے کے لئے یہ کارروائی کی کہ انہیں ڈرا دھمکا کر اُن سے زیادہ رقم وصول کر لی۔ یہ بھی سوچ لو کہ موقع کا کوئی گواہ نہیں جس سے میں یہ ثابت کر سکوں کہ تم پر حملہ انہی لڑکوں نے کیا ہے۔ اگر انہوں نے اپنی صفائی میں شفیقہ کو عدالت میں پیش کر دیا تو تمہاری رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جاتے گی۔ اس شہر کا کوئی ایک بھی آدمی تمہارے حق میں بات کرنے والا نہیں"۔

میں دراصل اس کیس کو تھانے میں ہی ختم کر دینا چاہتا تھا اس لئے میں اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ رہا تھا۔ وہ ہل گیا اور راضی نامے پر آمادہ ہوگیا۔ کاغذی کارروائی کے بعد یہ کیس ختم ہوگیا۔

شفیقہ کے اغوا کا کیس ہنگامہ خیز تھا۔ یہ شہر کے معززین کا اور ایک شریف عورت کا کیس تھا جو پچیس میل دُور شہر میں مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ہر پیشی پر قصبے کے کئی لوگ مقدمہ سُننے کے لئے چلے جاتے تھے۔ آخر تمام ملزموں کو ایک ہی جیسی سزا ملی۔ پانچ ملزم تھے۔ مصطفےٰ کا باپ، سُسر، اغوا کرنے والے دو آدمی اور پانچواں تانگے والا جس نے شفیقہ کے مُنہ پر کپڑا پھینکا تھا۔ پانچوں کو دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ مصطفےٰ کے باپ اور سُسر کو قید کے علاوہ دو دو ہزار روپیہ جرمانے کی سزا بھی دی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ

چھ ماہ قید سنائی گئی۔ دونوں نے جرمانے کی رقم جمع کرا دی۔

اس واردات میں ایک عورت بھی شامل تھی جس نے شفیقہ کو اُس کے گھر جا کر بتایا تھا کہ مصطفےٰ کو کچھ ہوگیا ہے۔ میں نے اس عورت کو گواہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ وہ کوئی چالاک عورت نہیں تھی بلکہ بہت ہی غریب عورت تھی۔ میں اُس کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔

اس کیس کی داستان تو یہاں پر ختم ہوگئی تھی لیکن یہ پولیس اور عدالت کی حد تک ختم ہوتی تھی۔ مجھے پوری توقع تھی کہ یہ معاملہ آگے چلے گا اور یہ لوگ معلوم نہیں اسے کہاں تک پہنچا کر دم لیں گے۔ ایسی ہی باتوں اور وارداتوں سے خاندانی عداوتیں چلتی ہیں اور یہ اس کیس میں بھی چلیں۔

شفیقہ کے اغوا کے مقدمے کا فیصلہ سُن کر میں کورٹ سے نکلا تو میں نے اپنے جونیئر سب انسپکٹر کیدار وَرما سے کہا کہ ایک اور کیس کی تیاری کر لو۔

"ہاں ملک صاحب!" —— ورما نے کہا —— "یہ سلسلہ آگے چلے گا۔ دشمنی تو ان کی اب شروع ہوتی ہے"۔

مصطفےٰ کا باپ اور اُس کا سُسر ایک جرم کر بیٹھے تھے لیکن وہ جرائم پیشہ نہیں تھے۔ وہ تو اس شہر کے معزز افراد تھے۔ انہیں مصطفےٰ نے پکڑوایا تھا۔ ابوذر کی پٹائی ہوتی تھی۔ یہ بھی مصطفےٰ کا کام تھا۔ مصطفےٰ نے شفیقہ کے حق میں اپنے باپ اور سُسر کے خلاف گواہی دی تھی۔ اس سے شفیقہ کا باپ اور اُس کے بھائی مصطفےٰ سے بہت خوش تھے لیکن وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ شفیقہ کے ساتھ مصطفےٰ کے تعلقات پاکیزہ تھے۔

میں نے مصطفےٰ کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بچا کر رکھے اور شام کے بعد گھر سے دُور نہ جاتے ورنہ دشمن وار کر جائیں گے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے کوئی دھمکی دے یا کسی حرکت سے اظہار کرے کہ وہ انتقام کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ تھانے میں آکر رپورٹ درج کرائے اور میں اس شخص کی نیک چلنی کی ضمانت لے لوں گا۔

کسی کی رپورٹ کے بغیر میں ان لوگوں کے خلاف قبل از وقت ہی کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا، لیکن نقصِ امن کے خطرے کے پیشِ نظر میں نے اپنے تمام مخبروں کو چوکنا کر دیا تھا کہ اُن تمام لوگوں کے ساتھ ساتھ رہیں کہ ان کے ارادے پہلے ہی معلوم ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی سنگین واردات خفیہ طریقے سے ہو جاتے اور میں سراغرسانی کے جھنجھٹ میں پھنس جاؤں۔

بیس بائیس روز ان میں سے کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ مخبروں سے مجھے یہ پتہ چلتا رہا کہ مصطفیٰ شفیقہ کے گاؤں میں چلا جاتا ہے اور کچھ دن وہیں گزارتا ہے۔ ان بیس دنوں میں اُس نے شاید وہاں کے دو پھیرے لگائے تھے۔ شفیقہ کا گاؤں دُور تھا لیکن وہاں تک پہنچنا کوئی مشکل تو نہیں تھا۔

شفیقہ کے گاؤں مصطفیٰ کے جانے سے مجھے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ شفیقہ کے رشتہ دار مصطفیٰ کو مار ڈالیں گے یا مار پیٹ کر گاؤں سے نکال دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ صرف میں تھا جسے یقین تھا کہ شفیقہ اور مصطفیٰ کے تعلقات بہن بھائی یا ماں بیٹے جیسے تھے۔ لیکن یہ دونوں آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے تو نہیں تھے۔ کسی بھی وقت ان کے تعلقات دوسرا رنگ اختیار کر سکتے تھے۔ اس کا زیادہ امکان مصطفیٰ کی طرف سے تھا۔ وہ شفیقہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک طرف وہ شفیقہ کو اپنی مری ہوئی ماں کا نعم البدل سمجھتا ہے اور دوسری طرف وہ اُسے ایسی عورت سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُس کی شادی ہو سکتی ہے۔ لوگ فلسفہ اور نفسیات نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ اتنی خوبصورت عورت اور اتنے خوبصورت نوجوان کی اتنی زیادہ بے تکلفی پاک ہو سکتی ہے۔ گاؤں کے لوگ، خصوصاً اُس زمانے میں ایک ہی راستہ جانتے تھے کہ اس طرح ملنے ملانے والے مرد اور عورت کو ختم کر دو۔

میری ان باتوں سے آپ کو یہ تاثر ملا ہو گا کہ یہ کوئی بڑے ہی اہم اور اونچے درجے کے لوگ تھے جنہیں میں ایک دوسرے سے تحفظ دینے

کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ یہ سب عام قسم کے شہری تھے جنہیں آپس کے خون خرابے سے بچانا میرا فرض تھا اور اس میں میرا فائدہ بھی تھا۔ اگر ان کے درمیان کوئی واردات ہو جاتی تو ملزموں کو پکڑنے کی مصیبت میرے سر آتی تھی۔ میں اپنے سر سے مصیبت ٹالنے کی کوشش میں تھا۔

ایک روز مصیبت آ ہی گئی۔ مصطفیٰ کا چچا تھانے میں آیا اور اُس نے کہا کہ مصطفیٰ لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں ذہنی طور پر ایسی ہی رپورٹ کے انتظار میں تھا بلکہ مجھے یہ توقع بھی تھی کہ ایک نہ ایک دن مصطفیٰ کے قتل کی رپورٹ آئے گی۔

"کیا آپ کو ایسا شک تو نہیں کہ وہ قتل ہو گیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"شک تو ہے جناب!" — اُس نے جواب دیا — "لڑکا بڑے غلط چکر میں آیا ہوا تھا۔ جن لوگوں پہ ہمیں شک ہے اُنہوں نے اُسے قتل ہی کر دیا ہو گا۔"

"شک کس پر ہے؟"

"لکھیں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "وہ شفیقہ کے گاؤں سے لاپتہ ہوا ہے۔ شفیقہ کا باپ ہے اور اُس کے دو بھائی ہیں۔ تین چار چچا زاد بھائی ہیں اور وہ سب شریف لوگ بھی نہیں۔ اُن کی شرافت تو اسی سے بے پردہ ہو جاتی ہے کہ اُن کی بیٹی شفیقہ ہمارے محلے میں خاوند کی وفات کے بعد اکیلی گھر میں رہی۔ ہمارا لڑکا بھی اُس کے پاس جاتا رہا اور البوذر بھی جاتا رہا۔ ان کا شفیقہ کے ساتھ خون کا رشتہ ہی کیا تھا۔"

"میں یہ بیان بعد میں لوں گا" — میں نے کہا — "کچھ نہ کچھ تو میں بھی جانتا ہوں کہ کون شریف اور کون بدمعاش ہے۔ ابھی آپ میرے سوال کا جواب دیں ..... جس جس پر شک ہے اُس کا نام، ولدیت، ذات اور پتہ لکھوا دیں۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ اپنے کسی دشمن کو صرف پریشان کرنے کے لئے اُس کا نام نہ لکھوانا۔ اگر بعد میں پتہ چلا کہ آپ نے کسی کو پولیس کے ہاتھوں تنگ کروانے کے لئے مشتبہ لکھوا دیا تھا تو میں آپ کو اسی جرم میں گرفتار کر

لوں گا۔"

"جناب!" — مصطفےٰ کے چچا نے اُداس لہجے میں کہا — "گستاخی معاف، سیانے کہتے ہیں جس کے گھر چوری ہوتی ہے اُس کی نظر میں سب چور ہوتے ہیں۔ مجھے یہ غم ہے کہ لڑکے کا باپ اندر بند ہے۔ لڑکا اکیلا ہے۔ گھر میں اُس کی صرف دو بہنیں ہیں۔ میں ہی ہوں جو اُن کے سر پہ ہاتھ رکھتا ہوں.... ہماری کسی کے ساتھ ایسی دُشمنی نہیں کہ میں اُنہیں جھوٹ بول کر تنگ کرواؤں گا۔ آپ کو خود معلوم ہے کہ مصطفےٰ اور شفیقہ کا آپس میں ایسا تعلق ہے جو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لڑکا شفیقہ کے گاؤں چلا جاتا تھا۔ اب وہ چار پانچ دنوں سے وہیں تھا۔"

"آپ کو کیسے یقین ہے وہ وہیں تھا؟" — مَیں نے پوچھا اور اُسے سمجھایا — "اب میں آپ کی ہر بات کا ثبوت مانگوں گا۔ یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے ایک بات کہہ دی اور میں نے مان لی۔"

"میں جناب کو پوری بات سُنا دیتا ہوں" — اُس نے کہا — "جب سے شفیقہ یہاں سے اپنے گاؤں گئی ہے مصطفےٰ وہاں جاتا رہا ہے۔ کبھی دو دن کبھی چار دن بھی وہیں گزار آتا تھا۔ دو بار اس طرح ہُوا کہ اُس کی دونوں بہنیں شفیقہ کے گاؤں گئیں اور مصطفےٰ کی منت کی کہ وہ گھر چلے۔ مصطفےٰ آتو جاتا تھا لیکن یہ بھی کہتا تھا کہ وہ اپنے گھر نہیں رہے گا، باقی عمر شفیقہ کے گھر گزارے گا۔ اگر وہاں بھی کسی نے نہ رہنے دیا تو پھر سوچے گا کدھر جائے۔"

"تو ہو سکتا ہے وہ خود ہی کہیں چلا گیا ہو" — میں نے کہا اور پوچھا — "آپ کو یہ شک کیسے ہُوا ہے کہ اُسے لاپتہ کر دیا گیا ہے؟.... کیا آپ یہ رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں کہ وہ لاپتہ ہو گیا ہے یا یہ کہ اُسے لاپتہ کر دیا گیا ہے؟"

"لاپتہ کر دیا گیا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے تو یہی شک ہے اور شک یہ بھی ہے کہ اُسے قتل کر دیا گیا ہے.... وہ چھ سات دنوں سے شفیقہ کے گاؤں گیا ہُوا تھا۔ اُس کی دونوں بہنیں جس طرح پہلے اُس کے پیچھے جاتی تھیں،

اب بھی گئیں کہ اپنے بھائی کو واپس لے آئیں۔ شفیقہ کے گھر گئیں تو اُس نے بتایا کہ وہ اُس کے ہاں آیا تھا اور اگلے روز شفیقہ کو یہ بتا کر کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، چلا گیا تھا۔ آپ بھی غور فرمائیں جناب کہ اُسے شفیقہ کے گھر سے نکلے پانچ چھ دن گزر گئے ہیں۔ وہ گیا کہاں؟ ہمارا شک غلط نہیں ہو سکتا کہ شفیقہ کے باپ اور بھائیوں وغیرہ نے اُسے شفیقہ کے پاس جانے سے روکا ہو گا۔ لڑکا جرأت والا اور غصے والا ہے۔ وہ آگے سے بول پڑا ہو گا اور ان لوگوں نے اسے راستے میں اِدھر اُدھر کر دیا جب وہ وہاں سے اپنے شہر کی طرف آ رہا تھا۔"

میں آپ کو یاد دلا دوں کہ شفیقہ کا گاؤں دُور تھا۔ ریل گاڑی سے بھی اور لاری سے بھی جایا جا سکتا تھا لیکن ایک کچی پگڈنڈی بھی شہر کو آتی تھی جس پر یکے اور تانگے چلتے تھے۔ عام طور پر لوگ اس پگڈنڈی سے آتے تھے۔ یہ پگڈنڈی شہر سے کچھ دُور ایک اور طرف مڑ جاتی تھی۔ وہاں سے بعض لوگ پیدل شہر تک آجاتے تھے یا شہر کی طرف آنے والے تانگوں پہ آجاتے تھے۔

بہرحال آپ کو میں ان بھول بھلیوں میں نہیں اُلجھانا چاہتا۔ آپ راستوں اور مختلف جگہوں کے نقشے کو سمجھنے میں مغز نہ کھپائیں۔ پولیس اس قسم کی تفصیلات کو اپنی اصطلاحوں میں لکھا کرتی ہے۔ وہ میں لکھ کر کہانی کی دلچسپی اور آپ کے مُنہ کا ذائقہ خراب نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کے لیے کہانی کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کی کوشش کروں گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ شفیقہ کے گاؤں سے شہر کی طرف آنے میں ایسے امکانات موجود تھے کہ کسی کو اِدھر اُدھر کیا جا سکتا تھا۔

مصطفےٰ کے چچا نے شفیقہ کے باپ اور دونوں بھائیوں کو مشتبہ لکھوایا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ابوذر پر بھی شک کیا۔ میرا اپنا شک ابوذر پہ تھا اور یہ شک تو میرے ذہن میں بالکل واضح تھا کہ مصطفےٰ قتل ہو چکا ہے۔ میں نے جن افراد کو تھانے بلانا تھا اُن میں شفیقہ سرِفہرست تھی۔ میں نے اُسی وقت جن افراد کو تھانے بلانے کا حکم دیا اُن میں ایک تو شفیقہ تھی، اُس کا باپ اور دو بھائی تھے اور ایک ابوذر تھا۔ انتقام تو ابوذر نے بھی لینا تھا۔

مجھے خاوند بن کر دکھاؤ

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب میں نے شفیقہ کو اپنے دفتر میں اپنے سامنے بٹھایا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"شفیقہ!" ___ مَیں نے شفقت کے لہجے میں پوچھا ___ "یہ آنسو کس کے لئے ہیں؟.... اپنے خاوند کے لئے یا مصطفےٰ کے لئے؟"

"دونوں کے لئے" ___ شفیقہ نے جواب دیا ___ "خاوند تو مر گیا ہے اس لئے صبر اور شکر کر کے دل کو دھوکا دے لیا ہے لیکن مصطفےٰ نے تو میری زندگی کو کانٹوں سے بھر دیا ہے"۔

"شفیقہ!" ___ میں نے کہا ___ "تم نے پہلے بھی مجھے بیان دیا تھا۔ یاد کرو کتنے ہی گھنٹے ہم یہاں آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ کیا تم نے کسی بھی وقت محسوس کیا تھا کہ میں تھانیدار ہوں؟ میں نے بڑے بھائیوں کی طرح تمہارا بیان لیا تھا۔ اس کے بعد ہم مقدمے کے دوران عدالت میں بھی اکٹھے ہوتے رہے۔ مَیں نے تمہاری عزّت بچائے رکھنے کے لئے اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال دیا تھا"۔

"مجھے سب یاد ہے بھائی جی!" ___ اُس نے آہ بھر کر کہا ___ "آپ کی مہربانیوں اور محبت کو میں ساری عمر یاد رکھوں گی"۔

"میں نے تمہیں یہ باتیں ایک خاص مقصد کے لئے یاد دلائی ہیں" ___ مَیں نے کہا ___ "میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ہر ایک بات صحیح اور سچ بتانا .... کیا اب بھی تمہارے دل میں مصطفےٰ کی اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی؟"

"سچ پوچھتے ہیں آپ؟" ___ اُس نے جواب دیا ___ "محبت پہلے سے زیادہ ہے۔ اگر یہ محبت ویسی ہوتی جیسی لوگ سمجھ رہے ہیں تو اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ محبت نہیں ہوتی۔ وہ تعلقات ہوتے ہیں جو کسی کے ساتھ بھی جوڑے جا سکتے ہیں"۔

"وہ تمہارے پاس تمہارے گاؤں میں جاتا رہا ہے" ___ میں نے کہا ___ "ظاہر ہے تمہیں تو خوشی ہوتی ہو گی لیکن تمہارے گھر والے اس میل جول کو پسند نہیں کرتے ہوں گے .... کیا تمہارے باپ یا بھائیوں نے تمہیں کبھی کچھ کہا نہیں تھا؟"

"بہت کچھ کہا تھا جی!" ___ اُس نے جواب دیا ___ "میرے والد صاحب اور دونوں بھائی اور میری ماں بھی مصطفےٰ کو اس وجہ سے بہت پسند کرتے تھے کہ اُس نے میری خاطر اپنے باپ اور اپنے سُسر کے خلاف کچہری میں کھڑے ہو کر گواہی دی تھی، لیکن وہ آخر جوان آدمی ہے۔ اِدھر مَیں بھی جوان ہوں۔ کون برداشت کر سکتا ہے کہ جوان مرد عورت اس طرح آپس میں ملیں جُلیں"۔

"کیا تم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ مصطفےٰ کے ساتھ تمہاری محبت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی طرح بتایا تھا" ___ اُس نے جواب دیا ___ "اور انہوں نے مان بھی لیا تھا کہ میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے اُنہیں سیدھی بات کہہ دی تھی کہ یہ میرا چھوٹا بھائی بھی ہے اور اسے میں اپنا بچّہ بھی سمجھتی ہوں .... میرے سَر پر قرآن رکھ دو بھائی جی! میں کہوں گی کہ کبھی تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے مصطفےٰ نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے اور میرے دو بچّے مر گئے تھے۔ اُن دونوں کی روحیں مصطفےٰ میں ہیں"۔

"لیکن شفیقہ!" ___ میں نے کہا ___ "وہ تمہیں ماں یا بہن سمجھتا تو تمہارے ساتھ شادی کا اُس کے دل میں خیال نہ آتا۔ کبھی تو وہ تمہیں ایک عورت سمجھتا ہو گا اور تم نے بھی اُسے کبھی ایک خوبصورت مرد سمجھا ہو گا"۔

اُس نے سَر جھکا لیا اور کچھ دیر سوچ میں پڑی رہی۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔

"بھائی جی!" ___ اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا ___ "کچھ باتیں ایسی ہیں جو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم نے بے شرموں والی کبھی کوئی حرکت تو

نہیں کی، لیکن آپ کچھ اور شک کر سکتے ہیں۔"

"شفیقہ!" — میں نے کہا — "میں تمہاری اور مصطفیٰ کی نیّت کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ باتیں سناتے ہوتے پوری طرح بے شرم ہو جاؤ۔ میں نے پہلے بھی تم پر پردہ ڈالا تھا۔ اب بھی ڈالوں گا۔"

"کیا آپ مصطفیٰ کو ڈھونڈیں گے؟" — اُس نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"اگر تم مجھے کوئی راستہ دکھاؤ گی تو میں اُسے ڈھونڈ لوں گا" — میں نے کہا — "کوئی بات چھپا کر نہ رکھنا۔۔۔ اب وہ بات سناؤ جو سناتے ہوئے تمہیں شرم آتی ہے۔"

"وہ بات اس طرح ہوئی" — اُس نے کہا — "کہ وہ ضد کرتا تھا کہ مَیں اُس کے ساتھ شادی کر لوں۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب میں یہاں اپنے مرے ہوئے خاوند کے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ میں نے مصطفیٰ کو ایک روز کہا کہ ہماری شادی ہو بھی گئی تو بھی ہم خاوند اور بیوی نہیں بن سکیں گے۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔"

شفیقہ کے بیان کا یہ حصہ بڑا نازک ہے جو ذرا گہرائی میں جا کر سمجھنا پڑتا ہے۔ اگر میں یہ شفیقہ کے الفاظ میں سناؤں تو کئی قارئین کہیں گے کہ میں نے کتنی بے ہودہ بات سنائی ہے۔ پھر بھی نفسیاتی معاملہ ہے جس سے شفیقہ کی عقلمندی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مصطفیٰ کو یہ بات سمجھا رہی تھی کہ اُن کا نکاح ہو سکتا ہے لیکن وہ عملاً میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ وجہ بالکل صاف تھی۔ مصطفیٰ شفیقہ کو اپنی ماں کا اور شفیقہ مصطفیٰ کو اپنے بچوں کا نعم البدل سمجھتی تھی۔ مصطفیٰ نے اُس وقت شفیقہ کو اپنے ذہن میں ماں کی تصویر بنا کر بٹھا لیا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا اور اُس کی مردانگی ابھی بیدار ہوئی تھی۔ محترم میم۔ الف کی زبان میں آپ یوں کہہ لیں کہ شفیقہ مصطفیٰ کے ذہن لاشعور میں ماں کی حیثیت میں اُتری ہوئی تھی۔ شعوری طور پر وہ ہزار کوشش کرتا، اُس کا لاشعور شفیقہ کو بیوی کے روپ اور رول میں کبھی قبول نہ کرتا۔

نفسیات کے اس فلسفے سے نہ مصطفیٰ واقف تھا نہ شفیقہ۔ شفیقہ تو بالکل ہی ان پڑھ عورت تھی، لیکن انسانی نفسیات کے عمل اور ردِّ عمل سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ شفیقہ میں عقل ذرا زیادہ تھی۔ مصطفیٰ کی عقل ابھی خام تھی۔ شفیقہ نے چونکہ اُسے کبھی بھی خاوند کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اُس کا ذہن اُسے قبول نہیں کرتا تھا۔ اُس نے ایک روز مصطفیٰ سے کہا کہ وہ اُس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے اور مصطفیٰ اُسے اپنی بیوی کے روپ میں دیکھے اور تصور میں اُس کا خاوند بنے۔

"بھائی جی!" — شفیقہ نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا — "آپ چونکہ ہر بات سمجھتے ہیں اس لئے میں کوئی پردہ نہیں رکھ رہی۔ اس عمر میں بھی مصطفیٰ کو میں اپنے ساتھ لٹا لیتی تھی۔ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ تو جوان آدمی ہے۔۔۔۔

اُس روز میں نے اُسے کہا کہ تصور میں مجھے خاوند بن کر دکھاؤ۔ وہ تھوڑی دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اُس کے چہرے پر پریشانی سی دیکھی اور وہ سر کو اِدھر اُدھر زور زور سے ہلا کر پرے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔"

میں نے پہلے بھی غالباً کہا ہے کہ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا کہ ان دونوں کے آپس میں تعلقات کیسے تھے۔ میں صرف اپنی دلچسپی کی خاطر اور انسانی فطرت کو سمجھنے کے لئے اُس سے باریک باریک باتیں بھی پوچھ رہا تھا۔ تھانیدار کی حیثیت سے میرے لئے اتنی سی بات ہی کافی تھی کہ مصطفیٰ اور شفیقہ کا آپس میں میل جول تھا اور یہ قابلِ اعتراض تھا، تعلقات خواہ کیسے ہی تھے۔

شفیقہ نے اُس روز مصطفیٰ کو بڑے سخت امتحان میں ڈال دیا۔ مصطفیٰ نے بہت ہی پریشان اور مضطرب ہو کر تسلیم کر لیا کہ وہ شفیقہ کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اُسے بیوی نہیں بنا سکتا۔

شفیقہ دراصل مجھے یہ یقین دلا رہی تھی کہ مصطفیٰ کے ساتھ اُس کے تعلقات ناجائز ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مصطفیٰ نے اُس

کے ساتھ شادی کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا، لیکن اُس کی محبت پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی اور وہ اس طرح تھی جیسے چھوٹا سا بچہ اپنی ماں سے الگ نہیں ہوتا۔ جب تک شفیقہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد اُس کے گھر میں اکیلی رہتی رہی اُس وقت تو مصطفیٰ بے تکلفی سے اُس کے پاس بیٹھتا تھا لیکن گاؤں میں مصطفیٰ ایسی بے تکلفی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا کہ شفیقہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتے اور اُس کے ساتھ ماں بچے کی طرح کھیلے۔ اس کی بجائے شفیقہ نے اُسے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کبھی کبھار مہمانوں کی طرح آیا کرے۔ شفیقہ کا باپ اور بھائی وغیرہ کوئی شک نہ کریں۔

"پھر میں جاؤں کہاں؟" — مصطفیٰ نے شفیقہ سے متعدد بار پوچھا تھا۔

"اپنی بیوی کو گھر لے آؤ" — شفیقہ نے اُسے تین چار مرتبہ کہا تھا — "وہ تمہیں دل سے چاہتی ہے اور تمہیں پیغام بھی بھیج چکی ہے اور اُس کا پیغام مجھ تک بھی آ چکا ہے"

"یہ کیسا پیغام ہے؟" — میں نے شفیقہ سے پوچھا — "اس سے پہلے تو تم نے کسی ایسے پیغام کا ذکر نہیں کیا تھا"

"یہ بعد کی باتیں ہیں" — شفیقہ نے مجھے بتایا — "میں آپ کو یہ بھی سُنا دیتی ہوں"

پاگل ہو جاؤں گی

شفیقہ نے ایک نئی بات مجھے سنائی جو مختصراً یوں تھی کہ مقدمے کا فیصلہ ہوگیا تو مصطفیٰ کی بیوی نے ایک عورت کی زبانی مصطفیٰ کو پیغام بھیجا کہ وہ مصطفیٰ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔ مصطفیٰ کو تو اب یہ توقع تھی کہ اُس کی بیوی اُس سے طلاق مانگے گی کیونکہ مصطفیٰ نے اُس کے باپ کے خلاف گواہی دے کر اُسے دو سال سزائے قید دلائی تھی۔ پہلے تو اتنی سی بات

تھی کہ مصطفیٰ اُسے اپنے گھر نہیں لاتا تھا مگر اب دشمنی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی خود مصطفیٰ کے پاس آنے کی خواہش کرتی۔ اُس نے پیغام بھیجا تو مصطفیٰ نے اِسے کوئی چال سمجھا۔ اُس نے شفیقہ کو بتایا تو اُس نے بھی کہا کہ یہ لڑکی اپنے باپ کی قید کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

میں نے جب یہ سُنا تو مجھے بھی یہی خیال آیا کہ وہ اگر خود نہیں تو اپنی ماں یا اپنے بھائی کے کہنے پر مصطفیٰ کو پھانسنے کی ترکیب کر رہی ہے اور وہ مصطفیٰ کے پاس آ گئی تو اُسے دھوکے سے زہر دے دے گی یا اُسے مارنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرے گی لیکن یہ خیال میرے ذہن میں زیادہ دیر نہ رہا۔ زہر دینا یا کسی اور طریقے سے قتل کرانا یا خود کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ان گھروں کی کوئی عورت اتنا خوفناک جرم نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی میں اس لڑکی کے پیغام کے پیچھے جو نیت تھی اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

شفیقہ نے مجھے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ مصطفیٰ نے پیغام کا جواب دیا کہ وہ طلاق لینا چاہتی ہے تو اُسے مل سکتی ہے لیکن اُن کی زندگی اکٹھی نہیں گزر سکتی۔

تین چار دنوں بعد مصطفیٰ کو پھر اپنی بیوی کا پیغام ملا کہ تم مجھے اپنے گھر لے جانے کے لئے نہ آؤ، میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ لڑکی نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے ایک بار ملنے کا موقع دو۔ شفیقہ کے گھر آ جاؤ۔ میں بھی آ جاؤں گی۔ مصطفیٰ نے اب بھی اُسے ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ لڑکی شفیقہ کے پاس آ گئی۔ اُس وقت اُسے شک تھا کہ مصطفیٰ کو شفیقہ نے پھانس رکھا ہے۔ وہ شفیقہ کے آگے بہت روتی تھی اور اُس سے مصطفیٰ کو اس طرح مانگا تھا جس طرح بھکاری بھیک مانگتے ہیں۔

"بھائی جی!" — شفیقہ نے مجھے اب مصطفیٰ کی گمشدگی کے کیس میں بیان دیتے ہوئے کہا — "یہ اُس وقت کی بات ہے جب میرا خاوند مر گیا تھا اور میں اُس کی محبت اور جدائی کی ماری اُس کے گھر میں اکیلی پڑی تڑپ رہی

تھی جب یہ لڑکی میرے آگے رو رہی تھی تو مجھے ایسے لگتا تھا جیسے یہ مَیں ہوں جو خدا کے آگے رو رو کر فریاد کر رہی ہوں کہ خدا مجھے میرا خاوند واپس کر دے۔ اس لڑکی کے دل کی حالت کو اور اُس کی فریادوں کو میرے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا....

"مَیں نے اُس کا شک رفع کیا۔ اُسے وہی الفاظ کہے جو میں نے آپ سے کہے ہیں۔ اُسے صاف لفظوں میں بتایا کہ مصطفیٰ میرا بھائی بھی ہے اور بیٹا بھی.... یہ سُن کر اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے پھر میرے پاؤں چھُو لئے۔ وہ مجھے کہتی تھی کہ تمہارے سوا مصطفیٰ کو مجھ سے اور کوئی نہیں ملوا سکتا۔ میں نے اُسے بہت تسلیاں دیں اور کہا کہ میں خود مصطفیٰ کو کہتی رہتی ہوں کہ اپنا گھر برباد نہ کرے اور اب بھی اُسے کہوں گی۔ پہلے، مجھے اُس کی نیت پر کچھ تھا لیکن اب اُس کی آہ و زاری اور منت سماجت دیکھی تو میرا دل شکوک سے صاف ہو گیا۔ میں نے اُس روز اسی لڑکی کی طرح مصطفیٰ کے آگے رو رو کر کہا کہ وہ اسے گھر لے آئے لیکن وہ کہتا تھا کہ اُس کا دل جس چیز کو قبول ہی نہیں کرتا اُسے وہ کس طرح گھر لے آئے....

"اس کے بعد میں اپنے گاؤں میں آ گئی تو یہاں بھی اُس نے اُسی عورت کو میرے پاس بھیجا کہ تم اب چلی گئی ہو تو کسی طرح مصطفیٰ کو مناؤ۔ یہ عورت وہی تھی جو مجھے اس دھوکے سے اُس رات ساتھ لے گئی تھی کہ مصطفیٰ کو کچھ ہو گیا ہے اور مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ میں نے اُسے وہی جواب دیا جو پہلے دیتی رہی تھی۔ پھر مصطفیٰ گاؤں میں میرے پاس آیا تو اُس نے بتایا کہ یہ عورت ایک بار پھر اُس کی بیوی کا پیغام لائی تھی۔ اُس نے کہلا بھیجا تھا کہ میرے دل میں اس کی کوئی ناراضگی نہیں کہ تم نے میرے باپ کے خلاف گواہی دی ہے۔ میں خود اپنے باپ کو اچھا نہیں سمجھتی کہ اُس نے شفیقہ کو اغوا کرایا تھا۔ اگر شفیقہ وہاں سے نکل نہ آتی تو معلوم نہیں اس بے چاری کا کیا انجام ہوتا۔ ایک باپ ہی نہیں میرا پورا خاندان تباہ ہو جائے تو بھی میں پروا نہیں کروں گی

بشرطیکہ تم مجھے مل جاؤ۔"

"یہ عورت بہت چالاک معلوم ہوتی ہے جو پیغام لاتی تھی" — میں نے کہا — "اس نے تمہیں اغوا کرایا تھا تو میں نے اسے ملزم بنانے کی بجائے گواہ بنا لیا تھا۔ مجھے اس پر رحم آ گیا تھا کہ غریب عورت ہے۔"

"یہی اُس کا پیشہ ہے" — شفیقہ نے کہا — "بے چاری کا خاوند مر چکا ہے اور دو بیٹیوں کا بوجھ اُس کے سَر پر ہے۔ اُسے پیسے دے دو اور جو بھی کام کرانا چاہو وہ کر دیتی ہے۔"

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اس عورت کا نام پتہ بتا کر کہا کہ اُسے تھانے لے آئے۔

شفیقہ نے مجھے سنایا کہ یہ عورت ایک بار پھر مصطفیٰ کی بیوی کا پیغام لے کر اُس کے گاؤں گئی۔ اُس وقت اتفاق سے مصطفیٰ بھی شفیقہ کے پاس تھا۔ اب لڑکی نے یہ کہلا بھیجا تھا کہ میرے دل میں مصطفیٰ کی جو محبت ہے اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ اگر مصطفیٰ کچھ دن اور مجھے نہ ملا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اگر میرے ہوش ٹھکانے رہے تو میں خودکشی کر لوں گی.... یہ پیغام محبت کی دیوانگی کا اظہار کرتا تھا۔

اس عورت نے مصطفیٰ کو اُس کی بیوی کا ایک ایک لفظ سنایا اور اُس کی حالت بھی سنائی۔ یہ سب اتنا دردناک تھا کہ سناتے سناتے اس عورت کے بھی آنسو نکل آئے۔ اُس روز مصطفیٰ پر بھی کچھ اثر ہوا۔

"مصطفیٰ کو چُپ لگ گئی تھی" — شفیقہ نے مجھے سنایا — "اُس نے کسی حد تک اپنی بیوی کی محبت کو قبول کر لیا تھا۔ میں نے پیغام لانے والی عورت کو کچھ پیسے دیئے اور اُسے کھانا کھلا کر اور یہ تسلی دے کر بھیج دیا کہ پیغام کا جواب جلدی بھیجوں گی۔ اس عورت کے جانے کے بعد میں نے مصطفیٰ سے کہا کہ اتنی زیادہ محبت کرنے والی بیوی کوئی کوئی ہی ہو سکتی ہے بھائی جی! اگر آپ اُس لڑکی کو دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ کوئی عورت اتنی بھی خوبصورت

ہو سکتی ہے۔ پھر اُس کی عادتیں بھی بہت اچھی ہیں۔ مَیں نے اُس روز مصطفٰے کو تیار کر لیا تھا کہ وہ اُسے اپنے گھر لے آئے۔"

میں آپ کو مصطفٰے کی بیوی کے پیغام پورے پورے نہیں سُنا رہا۔ یہ جو لفظ "محبت کی دیوانگی" استعمال کر رہا ہوں، یہ سو فیصد صحیح ہے۔ اگر آپ یہ پورے پیغام سُنیں تو آپ کہیں گے کہ یہ لڑکی مایوس ہو کر واقعی خودکشی کر لیتی۔ اُس نے شفیقہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مصطفٰے کو شفیقہ سے ملنے سے نہیں روک سکے گی۔

"دیکھو مصطفٰے!" —— شفیقہ نے اُسے کہا تھا —— "اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میں اور تم میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ تمہارا میرے گاؤں میں آنا بھی بند ہو جاتے گا۔ مجھے میری ماں بھی کہہ چکی ہے کہ ایک جوان آدمی کا اتنی دُور سے آ کر اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔ گاؤں میں ہمارے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ میرے دونوں بھائیوں نے مجھے ابھی اشاروں میں کہا ہے کہ مصطفٰے کا بار بار یہاں آنا اچھا نہیں لگتا..."

"میری یہ بات سُن کر مصطفٰے کا چہرہ مُرجھا گیا اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اُس نے مجھے پہلی بار یہ بتایا کہ وہ اپنے گھر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ اُس کی بہنیں تو بڑے پیار سے اُس کے پیچھے میرے گاؤں تک پہنچ جاتی تھیں لیکن گھر میں ہی بہنیں اُس کے ساتھ سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتی تھیں اور اُسے طعنے دیتی تھیں کہ اُس نے ایک عورت کے پیچھے اپنے باپ کو دو سال جیل دلا دی ہے۔ مصطفٰے کی چچی بھی اُسے ایسے ہی طعنے دیتی تھی۔ اپنے کسی بھی ماموں کے گھر یہ بے چارہ جاتا تھا تو وہاں بھی اُسے یہی طعنے صاف لفظوں میں یا اشاروں میں سُننے پڑتے تھے۔ ایک تو میری محبت تھی جس سے مجبور ہو کر وہ میرے پاس آ جاتا تھا اور دوسرے یہ طعنے اور دُھتکار تھی جو اُسے اپنے گھر میں دو منٹ بیٹھنے بھی نہیں دیتی تھی....

"اب اُس نے میری زبان سے یہ سُنا کہ میری ماں اور میرے بھائی مجھے کہہ رہے ہیں کہ مصطفٰے کا آنا کم کرو تو مصطفٰے کا اتنا خوبصورت چہرہ بالکل ہی پھیکا پڑ گیا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اُسے اپنے پاس ہی رکھتی لیکن میری ماں نے اور میرے والد صاحب نے میری دوسری شادی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو ابھی در پردہ تھا لیکن مجھے اشارہ مل گیا تھا۔"

شفیقہ کا بیان بہت ہی لمبا ہو گیا تھا۔ تھانیدار کی حیثیت سے تو مجھے چند ایک باتیں پوچھنی تھیں لیکن میں اپنی عادت کے مطابق لمبے چکر میں پڑ گیا تھا۔ میں یہ سارا بیان آپ کو نہیں سُنا رہا۔ مختصراً سناتا ہوں کہ شفیقہ کے سارے بیان کو سامنے رکھ کر اس میں مصطفٰے کو درمیان میں رکھا تو اُس کی صورت یہ بن گئی کہ اپنے گھر میں اُس کے لئے طعنے رہ گئے تھے کہ اُس نے اپنے باپ اور سُسر کے خلاف گواہی دے کر انہیں سزا دلائی ہے۔ شفیقہ کے پاس آ کر اُسے جو روحانی سکون ملتا تھا وہ ختم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی اپنی بیوی کے محبت کے پیغام بھی اُس کے دل پر اثر کر گئے تھے۔ شفیقہ نے مجھے خاص طور پر بتایا تھا کہ اب وہ یہ نہیں کہتا تھا کہ اپنی بیوی کو نہیں بسائے گا۔

میں نے جب اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ مصطفٰے نے کہیں خودکشی کر لی ہو یا خود کہیں بھاگ گیا ہو۔ لیکن شفیقہ سے میں نے جب کچھ اور باتیں پوچھیں اور اس نے تفصیل سے جواب دیتے تو میرا شک بدل گیا۔ یہ اس طرح ہُوا کہ شفیقہ کو ماں نے ایک آدمی کا نام لے کر بتایا کہ اُس کی شادی طے ہو گئی ہے۔ شفیقہ کو ایسا اُبال آیا کہ اُس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ ماں نے اس کے باپ کو بتایا۔ باپ نے شفیقہ کو بلا کر بہت ڈانٹا اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں جانتا ہوں تم کیوں انکار کر رہی ہو۔ شفیقہ غصے میں تھی۔ اُس نے باپ کو بھی کچھ سخت الفاظ کہہ ڈالے۔ بات بڑھ گئی تو شفیقہ نے غصے اور جذبات

کی شدت میں یہاں تک کہہ دیا ـــ "ہاں، میں اُسی کی خاطر شادی نہیں کر رہی"۔
بھائیوں کو پتہ چلا تو اُنہوں نے شفیقہ کو مارا پیٹا تو نہیں لیکن اُس کی بے عزتی بہت کی۔ شفیقہ نے انہیں بھی کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ دو تین روز بعد مصطفیٰ آ گیا۔ شفیقہ کا بڑا بھائی مصطفیٰ کو الگ لے گیا۔ کچھ دیر بعد مصطفیٰ شفیقہ کے پاس آیا اور اُسے بتایا کہ اُس کے بھائی نے اُسے آنے سے منع کیا ہے اور اُس نے شفیقہ کے بڑے بھائی کو کوئی ناروا باتیں کہہ دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے شفیقہ سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

میں نے ان کے پہلے مقدمے کے دوران شفیقہ کے باپ اور بھائیوں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ اُن کے ساتھ باتیں بھی ہوتی تھیں۔ وہ معمولی سے لوگ نہیں تھے۔ اپنی ناک اور اپنی بات رکھنے والے لوگ تھے اور وہ ڈرنے والے بھی نہیں تھے۔ شفیقہ کو اغوا کرنے والوں کو سزا ہو گئی تو شفیقہ کے باپ نے مجھے کہا تھا کہ یہ خوش قسمت ہیں کہ جیل خانے میں جا رہے ہیں، انہیں سزا تو ہم نے دینی تھی۔

یہ تو جرأت اور روپے پیسے والے لوگ تھے، کوئی معمولی سی حیثیت کا باپ اور بھائی بھی یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتے جو شفیقہ نے کہی تھیں اور جو مصطفیٰ نے شفیقہ کے بھائیوں کو کہی تھیں۔ اس سے میرا یہ شک پختہ ہو گیا کہ مصطفیٰ کو شفیقہ کے بھائیوں نے لاپتہ کر دیا ہے اور وہ زندہ نہیں ہو گا۔ جس طرح مصطفیٰ کے باپ اور سُسر نے شفیقہ کو لاپتہ کیا تھا کہ وہ مصطفیٰ کی نظروں سے ہٹ جائے اسی طرح اِن لوگوں نے مصطفیٰ کو شفیقہ کی زندگی سے نکال دیا ہے۔

لاش برآمد کراؤ

میں نے اس شک کے تحت شفیقہ سے کچھ سوال پوچھے کہ مصطفیٰ کو

اُس کے بھائیوں نے اغوا کرایا ہے۔ مجھے توقع تو یہ تھی کہ شفیقہ اپنے باپ اور بھائیوں کو بچانے کے لئے مجھے گمراہ کرے گی لیکن اُس نے ایسا نہ کیا۔ میں جو پوچھتا گیا وہ بتاتی گئی۔ اُس کے سچ بولنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس نے مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے اُوپر غالب کر لیا تھا۔ دوسری وجہ اُس کی سادگی تھی۔ وہ چالاک نہیں تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ اُسے اپنے بھائیوں پر غصہ تھا جو اُس کی شادی زبردستی کر رہے تھے اور مصطفیٰ کو اُس کے پاس آنے سے روک رہے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ شفیقہ کے دل میں مصطفیٰ کی محبت کتنی زیادہ تھی۔

میرے سوالوں کے جواب میں شفیقہ نے جو کچھ کہا وہ مختصراً یوں تھا کہ شفیقہ کے بھائیوں اور مصطفیٰ کے درمیان زبانی جھڑپ ہو گئی تو بھائیوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ وہ فوراً اس گھر سے نکل جائے اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔ مصطفیٰ اُن کے جانے کے بعد شفیقہ کے گھر سے نکلا۔ میرے پوچھنے پر شفیقہ نے بتایا کہ اُس کے بھائی رات کو واپس آئے تھے۔

میرے حساب کے مطابق وہ چار پانچ گھنٹے گھر سے غیر حاضر رہے تھے۔ وہ جب واپس آئے تو شفیقہ کے ساتھ انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ دونوں اپنے باپ کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اُس کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

"کیا تمہیں کچھ شک نہیں ہُوا؟" ـــ میں نے شفیقہ سے پوچھا۔

"ہُوا تھا" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "وہ بڑے غصے میں باہر گئے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مصطفیٰ جانے لگا تو میرے دل میں آئی تھی کہ اُسے نہ جانے دوں کیونکہ میرے بھائی آگے چلے گئے تھے۔ میں نے اُسے اس وجہ سے نہ روکا کہ وہ یہاں رہا تو میرے بھائی آ کر اُسے مارنا پیٹنا شروع نہ کر دیں"۔

"اب تمہارا کیا خیال ہے؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کیا تمہیں یہ شک نہیں ہو رہا کہ مصطفیٰ کو تمہارے بھائیوں نے اِدھر اُدھر کر دیا ہے؟"

"اب تو مجھے پکا شک ہے کہ اُنہوں نے مصطفیٰ کو بالکل ہی لاپتہ کر دیا

ہے"۔ ۔شفیقہ نے کہا۔

میں نے شفیقہ کے ساتھ اُس کے بھائیوں کی گرفتاری اور سزا وغیرہ کے متعلق باتیں کیں تو میں نے دیکھا کہ اُسے ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا کہ اُس کے بھائی گرفتار ہو جائیں گے یا سزا پا جائیں گے۔

"ایک اور بات آپ کو بتا دوں"۔۔۔شفیقہ نے کہا ۔۔۔"ایک دو دنوں بعد بھائیوں نے مجھے کہا تھا کہ اُن کے اور مصطفےٰ کے درمیان جو باتیں ہوتی تھیں ان کا ذکر کسی کے ساتھ نہ کروں"

شفیقہ کی ہر ایک بات میرے شک کو پکا کر رہی تھی۔ میں نے اُسے باہر بیٹھنے کو کہا اور اُس کے باپ کو بلایا۔

"دیکھو جناب!"۔۔۔میں نے شفیقہ کے باپ سے کہا ۔۔۔"نہ خود لمبے چکروں میں پڑو نہ مجھے چکروں میں ڈالو۔ آپ صرف یہ کام کریں کہ لڑکے کو خود ہی تھانے میں پیش کر دیں۔"

"کس لڑکے کو جناب!"۔۔۔اُس نے پوچھا۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ایک دو منٹ دیکھتا ہی رہا۔ اُس نے میری آنکھوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ کبھی نظریں نیچی کر لیتا کبھی دائیں بائیں دیکھتا اور کبھی میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ میری یہ خاموشی اُسے پریشان کر رہی تھی۔

"آپ شاید اُس شہری لڑکے کی بات کر رہے ہیں جو ہمارے گھر میں آیا کرتا تھا"۔۔۔شفیقہ کے باپ نے کہا ۔۔۔"وہ تو ہمارے گھر سے چلا گیا تھا۔"

غور کریں کہ اُس نے یہ نہیں کہا کہ وہ لڑکا جو اُس کے گھر آیا کرتا ہے بلکہ یہ کہا کہ وہ آیا کرتا تھا۔ اس سے میں اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ مصطفےٰ زندہ نہیں۔

"آپ پہلے ہی جانتے تھے کہ میں کس لڑکے کی بات کر رہا ہوں"۔۔۔

میں نے کہا ۔۔۔"اب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں نے کس کا ذکر کیا ہے ....میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لڑکے کو تھانے میں پیش کر دیں۔ اس سے آپ کی بچت ہو جائے گی۔ اگر میں نے اُسے یا اُس کی لاش کو برآمد کیا تو پھر پھانسی کے تختے تک پہنچاؤں گا۔"

"میں لڑکا کہاں سے لاؤں جناب!"۔۔۔اُس نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

"پھر اپنے بیٹوں سے کہو کہ وہ لڑکا برآمد کرا دیں"۔۔۔میں نے کہا ۔۔۔"میں آپ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہوں۔ آپ لڑکے کو خود لے آئیں۔ میں یا تھانے کا کوئی اور آدمی آپ کے ساتھ نہیں ہو گا۔ مجھے ذرا سوچ کر جواب دیں۔ میں آپ کو زیادہ مہلت نہیں دوں گا۔"

"لڑکے کے متعلق مجھے کچھ پتہ نہیں جناب!"۔۔۔اُس نے غمزدہ سے لہجے میں کہا۔

"پھر اُس کی لاش برآمد کرا دو"۔۔۔میں نے کہا ۔۔۔"جب تک لڑکا زندہ یا مُردہ برآمد نہیں ہوتا آپ تھانے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ میں آپ کو یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔"

"کہاں سے برآمد کراؤں جناب!"۔۔۔اُس نے جھنجھلا کر کہا ۔۔۔"میں نے اُسے کہاں رکھا ہوا ہے۔"

"اپنے بیٹوں سے کہو"۔۔۔میں نے کہا ۔۔۔"کسی کا بیٹا غائب کر کے یہ نہ سمجھو کہ تم اپنے بیٹوں کو گھر لے جاؤ گے۔"

وہ ایک ہی سانس میں بہت سی قسمیں کھا گیا لیکن میں قسموں پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے ڈرا دھمکا کر بھیجا اور اُس کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ اُس سے بھی میں نے یہی کہا جو اُس کے باپ سے کہا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ سے زیادہ شدت سے انکار کرتا رہا۔ میرے پاس جو واقعاتی شہادت تھی وہ میں نے اُس کے آگے رکھی لیکن وہ نہیں مان رہا تھا۔ اس پر میں نے بے شمار سوال تیروں کی طرح

پھینکے لیکن وہ میرے جال میں آتا نظر نہ آیا۔ اُسے بھی باہر بھیج کر اُس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔

"تمہارے باپ اور بڑے بھائی نے بیان دے دیئے ہیں" — میں نے کہا — "اب تم بھی بیان دے دو۔"

"کیسا بیان؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ بیان کہ مصطفیٰ کو تم لوگوں نے کس طرح غائب کیا ہے" — میں نے کہا — "تمہارے باپ اور بھائی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تم سب کو بچا لوں لیکن تمہارا بیان بڑا ضروری ہے۔"

"میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ مصطفیٰ ہمارے گھر ہماری بہن سے ملنے آیا کرتا تھا" — اُس نے کہا — "آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جوان عورت کے پاس کسی جوان غیر مرد کا آنا اور اُس کے پاس بیٹھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہم پہلے تو برداشت کرتے رہے لیکن لوگوں کی باتیں سُنیں تو ہم نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ اس لڑکے کو یہاں آنے سے روک دے۔ ہماری یہ بات بہن کو بُری لگی۔ ہم نے مصطفیٰ سے کہا تو مصطفیٰ نے ہم پر دھونس جمانے کی کوشش کی۔ ہم نے اُسے کہا کہ وہ فوراً ہمارے گھر سے نکل جائے۔ پھر ہم باہر چلے گئے۔ واپس آئے تو وہ جا چکا تھا۔ ہمارا مطلب پورا ہو گیا۔"

"ہم سے تمہارا مطلب کیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "اس ہم میں کون کون شامل تھا؛ ایک تو تم دونوں بھائی تھے۔ کوئی اور بھی تھا؟"

"نہیں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "ہم دونوں ہی تھے۔"

"تم دونوں کتنی دیر بعد واپس آئے تھے؟"

"جلدی آ گئے تھے" — اُس نے جواب دیا۔

"اب تم نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے" — مَیں نے کہا — "تم نے میری بات اچھی طرح نہیں سُنی۔ تمہارا باپ اور بھائی صحیح بات بتا گئے ہیں۔ تم تین چار گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔ اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟"

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "ہم تین چار گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔"

"کہاں گئے تھے؟"

اُس نے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہ دونوں وہاں ایک بھینس کا سودا کرنے گئے تھے۔ میں نے اُس سے اُس آدمی کا نام معلوم کر لیا اور باہر جا کر ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ سائیکل لے کر اُس گاؤں جائے اور اُس آدمی کو تھانے لے آئے جس سے یہ بھینس کا سودا کرنے گئے تھے۔ پھر میں اندر آ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں ایک بات سمجھا دیتا ہوں" — میں نے کہا — "تم اپنے باپ اور بڑے بھائی کو بھی پھنسا رہے ہو۔"

"پھر مجھے یہ بتا دیں کہ اُنہوں نے کیا بیان دیئے ہیں" — اُس نے کہا — "پھر مجھ سے بھی ویسا ہی بیان لے لیں۔"

مَیں نے اس نوجوان کو بہت دھمکیاں دیں، لالچ بھی دیئے اور ہر طریقہ آزمایا لیکن وہ انکار ہی کرتا رہا۔ میں نے ابوذر کو بھی بلا رکھا تھا۔ سوچا کہ اس سے بھی دو باتیں کر لوں۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آ گئی جو میں نے شفیقہ کے چھوٹے بھائی سے پوچھی۔

"کیا شفیقہ کی شادی کی بات پکی ہو گئی ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"بالکل پکی جناب!" — اُس نے جواب دیا — "اب صرف دن مقرر کرنا ہے۔"

"کیا اُس آدمی کو جس کے ساتھ تم شفیقہ کی شادی کر رہے ہو، یہ معلوم ہے کہ شفیقہ کا تعلق مصطفیٰ کے ساتھ ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "اُسے معلوم ہے۔"

"کیا اُس نے اعتراض نہیں کیا تھا کہ شفیقہ کے پاس کوئی آدمی آتا ہے؟"

"کیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ کہتا تھا کہ میں یہ رشتہ اس شرط پر قبول کروں گا کہ اس لڑکے کا گھر میں آنا جانا بند کر دو۔ پھر ہم نے مصطفیٰ سے کہا تھا کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔"

رات خاصی گزر گئی تھی۔ میں نے ان سب لوگوں کے لئے معمولی سے کھانے کا انتظام کر دیا اور انہیں رات تھانے کے احاطے میں ہی گزارنے کا حکم جاری کر کے میں اپنے گھر چلا گیا۔

ناجائز ملاقات نہیں تھی

صبح کے تین سوا تین بج رہے تھے جب میں واپس تھانے میں آیا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا تھا کہ مصطفیٰ قتل ہو چکا ہے۔ اُسے لاپتہ ہوتے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ اگر ان لوگوں نے اُسے ڈرانا ہوتا تو ایک دو دن کہیں بند کر کے اُسے مار پیٹ کر چھوڑ دیتے۔ اتنے دن قید میں رکھنے کا کوئی مقصد نہیں تھا لیکن ابوذر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ تھانے میں آیا بیٹھا تھا بلکہ اُس نے رات تھانے میں ہی گزاری تھی۔ میں نے اُسے اپنے دفتر میں بٹھایا اور اچھی طرح سمجھایا کہ وہ خود مصطفیٰ کا اتا پتہ بتا دے تو میں معاملہ یہیں ختم کر دوں گا لیکن وہ صاف انکار کر گیا۔ میں نے اُس سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ تو رونے پر آ گیا۔ میں نے اور دباؤ ڈالا۔ سوالوں پر سوال کئے تو اُس کی زبان ہکلانے لگی۔

"میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں" — اُس نے کہا — "پہلے مصطفیٰ اپنے دو دوستوں کے ساتھ مجھے بیہوش کر کے پھینک گیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آپ اُس کے خلاف کارروائی کرتے۔ آپ نے اُلٹا مجھے ہی مشتبہ بنا دیا ہے۔"

"میں کہتا ہوں تم نے انتقام لیا ہے۔"

"نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "اگر میں انتقام لینا چاہتا تو مہینہ دو مہینے پہلے لے لیتا۔"

سورج نکلنے تک میں نے ابوذر کو بہت چکر دیئے۔ اُس کی حالت بہت خراب ہو گئی اور واقعی اُس کے آنسو نکل آتے۔ میں نے اُسے باہر بٹھا دیا اور سوچنے لگا میرا اگلا قدم کیا ہو۔ اتنے میں شفیقہ کا باپ اندر آ گیا اور کہنے لگا کہ وہ ذرا بات کرنا چاہتا ہے۔

"جناب آپ نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے" — اُس نے کہا — "ذرا خود ہی سوچیں کہ اس لڑکے کو ہم کیوں غائب کرتے۔ اس بے چارے نے ہمارا کیا بگاڑا تھا۔"

"کیا اس کے ساتھ آپ کی بیٹی کے تعلقات جائز تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"بالکل جائز تھے جناب!" — اُس نے کہا — "مجھے پورا یقین ہے کہ ان کے تعلقات بہن بھائی والے تھے۔ یہ تو لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے ہم نے اُسے اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بیٹوں کے ساتھ مصطفیٰ کی تلخ کلامی ہوتی تھی" — میں نے کہا — "اور آپ کے بیٹوں نے انتقام لیا ہے ....آپ باہر بیٹھیں۔ سوچ لیں پھر میرے پاس آئیں۔"

میں آپ کو ایک ایک منٹ کی کارگزاری نہیں سُنا سکتا۔ موٹی موٹی باتیں سناتا ہوں۔ ابوذر کو میں نے اپنے چکر میں لیا ہُوا تھا لیکن وہ رو پڑا تھا۔ اُسے میں نے مزید ڈرا دھمکا کر باہر بٹھا دیا۔ مخبروں کی رپورٹیں بھی ملنے لگیں۔ کام کی ایک بات معلوم ہوئی۔ ابوذر شہر سے چار پانچ دن غیر حاضر رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو ابوذر کے خلاف میرا شک کچھ پختہ ہو گیا۔ میں نے اُسے بلایا۔

"ان دنوں تم کہیں باہر تو نہیں گئے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "میں نے کہاں جانا تھا!"

"تمہاری بیوی کو تھانے بلا کر پوچھوں؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اس میں سوچنے والی کیا بات ہے؟" — میں نے پوچھا — "تم کہیں باہر گئے ہو گے یا نہیں گئے ہو گے۔ صاف بتا دو۔"

اُس نے بڑے شہر کا نام لے کر کہا کہ وہ ایک دو دنوں کے لئے وہاں گیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں گیا تھا اور کس کے پاس ٹھہرا تھا؟ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ جس جگہ کا اور جس آدمی کا نام لے گا اُس کی تصدیق کرائی جائے گی کہ وہ اُس جگہ اُس آدمی کے پاس گیا تھا۔

"جناب!" — اُس نے کہا — "آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ میں فلاں فلاں دن شہر میں نہیں تھا۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ میں شہر میں نہیں تھا پھر جھگڑا کیا رہ جاتا ہے؟ میں کہہ رہا ہوں میں نے انتقام لینا ہوتا تو پہلے لے لیتا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ مصطفےٰ شفیقہ سے ملنے اُس کے گاؤں جایا کرتا تھا؟"

"معلوم ہے جناب!" — اُس نے جواب دیا — "سارے محلے کو معلوم ہے۔ اس لڑکے نے اپنے خاندان کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔"

"لیکن وہ اب کہاں چلا گیا ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا — "کہیں وہ اُدھر ہی تو نہیں چلا گیا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "مجھے پتہ ہی کیسے چل سکتا ہے وہ کہاں ہے اور کہاں چلا گیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے اُسے ذہن سے اُتار دیا ہے۔"

"ہاں، اب بتاؤ" — میں نے کہا — "تم کہاں گئے تھے؟"

میں آپ کو تمام سوال جواب نہیں سناؤں گا۔ آپ کی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہ بتا نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ جس جگہ کا بھی نام لے گا میں وہاں سے معلوم کراؤں گا کہ وہ وہاں گیا تھا۔ میں اُسے کہتا تھا کہ وہ یہ بھی بتا دے کہ وہ اُس جگہ کا نام کیوں نہیں بتاتا اور جسے ملنے گیا تھا اُس کا نام کیوں چھپا رہا ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہتا تھا

کہ یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے۔

میں اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ پہلے تو آپ کو بتایا ہے کہ وہ رو پڑا تھا مگر اب وہ ڈھیٹ اور دلیر ہو گیا اور اُس نے صاف کہہ دیا کہ وہ نہیں بتائے گا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ یہ تو میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص عقل ذرا کم ہی رکھتا ہے۔ اُس نے گھبراہٹ میں ایسی باتیں کہہ دیں جن سے اُس کے خلاف شک مزید پختہ ہو گیا۔ اُسے غالباً کسی نے یہ بتا دیا تھا کہ تھانے میں دل کو مضبوط رکھا جائے تو عدالت میں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔

میں نے اُس کے ساتھ دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اُسے ایک کانسٹیبل کے حوالے کر کے اشارہ کر دیا۔

وہ عورت آئی ہوئی تھی جس نے شفیقہ کو اغوا کرایا تھا اور اب مصطفےٰ کی بیوی کے پیغام مصطفےٰ اور شفیقہ کو پہنچاتی رہی تھی۔ مجھے ایک شک یہ تھا کہ مصطفےٰ کی بیوی کے بھائیوں نے ہی انتقام نہ لیا ہو۔ اس عورت کو بلا کر پوچھا۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ عورت عقل والی اور باریک بات بھی سمجھنے والی تھی۔

"لڑکی تو اس لڑکے کے پیچھے پاگل ہوتی جا رہی ہے" — اُس نے مصطفےٰ کی بیوی کی بات کرتے ہوئے کہا — "اُسے اپنے باپ پر غصہ ہے کہ اُس نے شفیقہ کو اغوا کرایا تھا۔ اُس نے مجھے کہا ہے کہ کسی عامل سے اُسے تعویذ لا دوں یا کالا جادو کرا دوں کہ مصطفےٰ اُسے مل جائے۔"

"اُس کے بھائی کیا کہتے ہیں؟" — میں نے پوچھا — "مصطفےٰ کو گالیاں دیتے ہوں گے!"

"نہیں" — اُس نے کہا — "وہ مصطفےٰ کو بُرا بھلا ضرور کہتے ہیں لیکن جب اپنی بہن کو دیکھتے ہیں کہ وہ طلاق نہیں لینا چاہتی اور مصطفےٰ کے پاس جانا چاہتی ہے تو بھائی چُپ ہو جاتے ہیں .... میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس لڑکی کو مصطفےٰ نے نہ بسایا تو وہ کچھ کھا کر مر جائے گی۔"

اس سے بھی کُرید کُرید کر بہت کچھ پوچھا لیکن جذباتی باتوں کے سوا کچھ

اور حاصل نہ ہُوا۔ اُسے میں نے سختی سے کہا کہ وہ یہ پیشہ چھوڑ دے ورنہ کسی اور کے جُرم میں پکڑی جائے گی۔ میں نے پہلے اُس کی غربت اور مجبوری کو دیکھ کر بچا لیا تھا حالانکہ وہ شفیقہ کے اغوا کی واردات میں شامل تھی۔ میرے ہمدردانہ رویّے اور سلوک سے وہ اتنی متاثر ہوئی کہ اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس کے دل میں رُکی ہوئی ایک اور بات نکل آئی۔

"اپنی دو بیٹیوں کے لئے یہ کام کر رہی ہُوں" — اُس نے کہا — "کہتی ہوں انہیں عزّت سے ڈولی میں بٹھا دوں .... ایک بات دل میں رہ گئی تھی .... مصطفیٰ اور گُل (مصطفیٰ کی بیوی) کی ایک ملاقات بھی ہو چکی ہے۔"

"کب ہوئی؟"

"یہی کوئی سات آٹھ دن گزرے ہوں گے" — اُس نے جواب دیا — "ملاقات میں نے کرائی تھی۔ شام کے بعد لڑکیاں محلے کے ساتھ میدان اور اس کے ساتھ جو کھیت ہیں، اُدھر نکل جاتی اور گپیں مارتی اور گھروں کو چلی جاتی ہیں۔ گُل نے مجھے کہا تھا کہ کسی بہانے مصطفیٰ کو رات کو اُدھر لے آؤ۔ میں نے مصطفیٰ کو بڑی مشکل سے راضی کیا اور اُسے کہا کہ وہ اُس کی بیوی ہے، ایک بار اُس سے مل لے اور اُس کی زبانی اُس کے دل کا حال سن لے۔ یہ میری اُستادی تھی کہ اُسے رات کو وہاں پہنچا دیا ....'

"گُل کے ساتھ اُس کی دو سہیلیاں تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مصطفیٰ آ رہا ہے۔ یہ کوئی ناجائز ملاقات تو نہیں تھی۔ دوسرے دن میں گُل کے پاس گئی تو اُس نے بتایا کہ مصطفیٰ رات کو وہاں چلا گیا تھا۔ گُل سہیلیوں سے ہٹ کر اُس کے پاس گئی۔ اُس نے مجھے ساری باتیں تو نہیں سنائیں، وہ خوش تھی۔ کہتی تھی کہ مصطفیٰ میری باتیں سن کر رو پڑا تھا اور کہتا تھا کچھ سمجھ نہیں آتی کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ اپنی چچی، بہنوں اور قریبی رشتہ داروں کے طعنوں سے وہ تنگ آیا ہُوا تھا ....

"میں نے گُل سے پوچھا تھا کہ شفیقہ کے متعلق بات نہیں ہوتی؟ اُس

نے بتایا کہ بات ہوئی تھی۔ مصطفیٰ کہتا تھا کہ شفیقہ کے ساتھ میری محبت میاں بیوی والی نہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس کے دل میں ایسی محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن اُس نے دل سے نکال دی تھی .... گُل نے مجھے بتایا تھا کہ مصطفیٰ سیدھے راستے پر آ جائے گا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کہیں نظر نہیں آیا۔ گُل کو پتہ چلا ہے کہ مصطفیٰ لاپتہ ہے تو وہ رو رو کر بُرا حال کر رہی ہے۔"

ہوٹل اور طوائف

آہستہ آہستہ مجھے غصّہ آنے لگا۔ میں غصّے کو اپنے قابو میں رکھا کرتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر غصّہ آ گیا۔ میں نے اِس واردات کے جذباتی پہلو کو سامنے رکھ لیا تھا۔ میں اُس وقت جوان تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں اس کیس کی رومانی باتیں سُن کر چسکا لگا رہا ہوں۔ مجھے واقعاتی شہادت کی طرف توجّہ دینی چاہیئے تھی۔

میں نے اس عورت کو جانے کی اجازت دے دی اور غصّے کی حالت میں ارادہ کیا کہ جس جس پر شُبہ ہے اُسے اُلٹا لٹکا دوں گا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مصطفیٰ قتل ہو گیا ہوتا یا اُس نے کہیں خودکشی کر لی ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے اُس کی لاش کی اطلاع آ جاتی۔ اگر قاتلوں نے اُسے دفن کر دیا تھا تو پھر لاش کا کسی اور کے ذریعے ملنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے ابوذر کو جس ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کیا تھا، وہ آیا۔ کہنے لگا کہ ابوذر بولنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے ابوذر کو بولنے پر کس طرح آمادہ کیا ہے۔

ابوذر جب میرے دفتر کے دروازے میں داخل ہُوا تو ایسے لگتا تھا جیسے پچاس میل پیدل سفر کر کے آیا ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ دروازے سے میری میز تک چار یا پانچ قدم کا فاصلہ تھا جو اُس نے اِس

طرح طے کیا جیسے میری میز تک زندہ نہیں پہنچے گا۔ مَیں نے اُسے پانی پلایا اور کُرسی پر بٹھایا۔

"کہو" —— مَیں نے اُسے کہا —— "کیا کہتے ہو؟"

"ملک صاحب، بڑا افسوس ہے" —— اُس نے کہا —— "آپ نے بہت زیادتی کی ہے۔"

"بہت نہیں یار!" —— مَیں نے کہا —— "یہ تو پوری دیگ میں سے ابھی تمہیں دو تین چاول چکھاتے ہیں۔ تم نے اسی کو بہت کہہ دیا ہے۔ تمہاری عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر اب بھی مجھے چکر دو گے تو پھر اسی دیگ کے پاس بٹھا دوں گا۔ تھوڑے اور چاول کھا لینا ... مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم کہاں چلے گئے تھے۔ اگر جُرم کا اقبال کر لو گے تو فائدہ مجھ سے اُٹھاؤ گے۔"

"مَیں نے کوئی جُرم نہیں کیا جناب!" —— اُس نے کہا —— "میں آپ کو اس لئے نہیں بتا رہا تھا کہ مَیں کہاں گیا تھا کہ میں بڑی غلط جگہ چلا گیا تھا ... میں شہر عیاشی کی خاطر گیا تھا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ایک طوائف پسند آگئی تھی۔ میں تین راتیں اُس کے ہاں جاتا رہا۔"

"یہ بتاتے ہوئے تمہیں شرم کیوں آرہی تھی؟" —— میں نے طنزیہ کہا —— "تم کہاں کے پیش امام ہو۔ سیدھا کہتے کہ میں یہاں بھی جھک مارتا رہا ہوں اور وہاں دوسری قسم کی جھک مارنے گیا تھا۔"

اُس نے سر جُھکا لیا۔ میں نے تصدیق کرانی تھی۔ اکثر وارداتوں میں ملزم جائے وقوعہ سے غیر حاضری کو ثبوت کرنے کے لئے یہی کہتے ہیں کہ وہ فلاں جگہ طوائف بازی کے لئے چلے گئے تھے۔ میرے ساتھ پہلے یہ ہو چکا تھا۔ بعض پیشہ ور مجرم کسی طوائف کو پہلے ہی پیسے دے دیتے تھے کہ پولیس تفتیش کے لئے آئے تو وہ کہہ دے کہ یہ شخص شام سے صبح تک میرے کوٹھے پر رہا ہے۔ ابوذر چونکہ کم عقل والا آدمی تھا اس لئے اُس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ہوٹل میں رہا ہے۔ کوئی ہوٹل والا ایسا خطرہ اپنے سر نہیں لیتا کہ کسی مُشتبہ کے متعلق

جھوٹ بول دے کہ وہ اُس کے ہوٹل میں رہا ہے۔

میں نے اسی ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ ابوذر کے ساتھ بس یا ریل گاڑی سے اُس شہر جائے اور متعلقہ ہوٹل اور طوائف سے اس کے بیان کی تصدیق کرے۔

مَیں نے شفیقہ کے باپ اور دونوں بھائیوں کو اکٹھے بلا لیا اور انہیں کہا کہ وہ سیدھی بات پر آجائیں ورنہ میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔

"میں تم تینوں کو اکٹھا بٹھا دیتا ہوں" —— میں نے کہا —— "حالانکہ یہ طریقہ غلط ہے۔ مُشتبہوں کو اکٹھا نہیں بٹھایا جاتا۔ میں تمہیں آپس میں مشورہ کرنے کا موقع دیتا ہوں۔"

تینوں نے اکٹھے ہی بولنا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں خاموش کرایا اور کہا کہ وہ باہر جا کر بیٹھیں اور سوچیں۔ مَیں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ جب تک وہ میرا اطمینان نہیں کر سکتے تھانے سے باہر نہیں جا سکیں گے۔

"میری بیٹی کو بھی آپ بٹھائے رکھیں گے؟" —— شفیقہ کے باپ نے پوچھا۔

یہ تو مجھے یقین تھا کہ شفیقہ مصطفےٰ کو غائب کرنے میں شامل نہیں۔ اسے تو میں نے گواہ کے طور پر روکا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے کچھ رشتہ دار بھی آتے ہوتے تھے۔ میں نے شفیقہ کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی جائے اور جب وہ اپنے گاؤں جائیں تو ان کے ساتھ چلی جائے۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ کیس لٹک گیا ہے۔ کیس کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ دوسرے کیس بھی تھانے میں زیرِ تفتیش تھے۔ میں اُدھر مصروف ہو گیا۔

اگلے روز شام کے وقت ہیڈ کانسٹیبل ابوذر کو سیدھا میرے پاس لے آیا اور اپنی جیب سے دس دس روپے کے دس نوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" —— مَیں نے پوچھا۔

"یہ ابوذر صاحب سے پوچھیں" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "یہ مجھے شہر لے گیا۔ ایک ہوٹل میں مجھے خوب کھلایا پلایا اور کہنے لگا کہ یہیں سے واپس چلے چلو اور تھانے میں رپورٹ دینا کہ تم نے ہوٹل والے سے اور ایک طوائف سے تصدیق کر لی ہے کہ میں اس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور اس طوائف کے پاس جاتا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ چلو سودا طے ہو گیا۔"

ایک بات تو میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ اُس وقت کا سو روپیہ آج کل کے دو ہزار روپے کے برابر تھا۔ دوسری بات یہ کہ اُس وقت رشوت تو چلتی تھی لیکن ایسے نہیں کہ اتنی سنگین واردات میں پولیس کو خرید لیا جاتا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اتنی زیادہ رقم ٹھکرا دی تھی۔

میں نے ابوذر کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

"ملک صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "اس نے میرے ساتھ کل یہیں سودا طے کر لیا تھا۔"

"کل ہی بتا دیتے۔"

"بھولے ملک صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "میں کل ہی بتا دیتا تو یہ کہتا کہ یہ حوالدار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ یہ کہتا تھا کہ پہلے شہر تک چلو تاکہ شک نہ ہو پھر آ کر رپورٹ دو اور رقم مجھ سے لے لو۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے منایا کہ رقم شہر سے واپسی پر راستے میں دے دینا۔ ہم تھانے سے نکلے تو یہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں سے یہ پیسے لایا جو اس نے مجھے دکھائے اور ہم دونوں لاری سے شہر چلے گئے اور ہوٹل سے کھانا کھا پی کر آ گئے۔"

"اسے حوالات میں بند کر دو" — میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا — "رات دو اڑھائی بجے اس کی اُسی طرح خاطر تواضع کرنا جس طرح اس نے ہوٹل میں لے جا کر تمہاری کی تھی۔ میں صبح تک اس شخص کو ہوش میں نہیں دیکھنا چاہتا۔"

دس دس کے نوٹ میری میز پر پڑے تھے۔ ابوذر نے سوچا کہ اُس کا کام تو ہُوا نہیں پھر وہ اپنی رقم ضائع کیوں کرے۔ اُس نے نوٹ اُٹھانے کے لئے ہاتھ آگے کیا۔ میری چھڑی میز پر رکھی تھی۔ میں نے چھڑی اُٹھا کر زور سے اُس کے ہاتھ پر ماری۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ یہ رقم اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بڑی پھرتی سے نوٹ سمیٹے اور اپنی جیب میں ڈال لئے اور میرے کہنے پر اُس نے ابوذر کو حوالات میں لے جانے کے لئے بازو سے پکڑا۔

قصّہ ایک عورت کا

ابوذر وہیں جم کر کھڑا ہو گیا اور منتیں کرنے لگا کہ اُسے حوالات میں بند نہ کیا جائے۔ میں اُٹھا اور اُس کے قریب جا کر اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ سیدھا ہُوا تو اُلٹا ہاتھ میں نے اُس کے مُنہ پر مارا۔ پھر اُسے گریبان سے پکڑ کر بنچ پر پھینکا۔

"سچ بولو" — میں نے کہا — "کھال اُتار لُوں گا.... بولو۔"

"بتاتا ہوں" — اُس نے سسکتے ہوئے کہا — "آپ اپنی کُرسی پر بیٹھ جائیں۔"

وہ مجھے اس لئے بٹھانا چاہتا تھا کہ میں اُسے مزید تھپڑ نہ ماروں۔ مجھے اب یہ توقع تھی کہ یہ بتائے گا کہ مصطفےٰ کو اس نے کس طرح اغوا کیا ہے اور قتل کر کے اُسے کہاں پھینکا ہے لیکن اُس نے ایک اور ہی کہانی سُنا دی اور ایک اور گاؤں کا نام لے کر کہا کہ وہ وہاں گیا تھا۔

"دراصل میں اس بات پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا" — اُس نے کہا — "کیونکہ یہ بھی ایک جُرم تھا اور میں ڈرتا تھا کہ آپ مجھے اس جرم میں نہ پکڑ لیں۔ میرے ایک دوست نے جو ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہے، ایک جوان عورت کو اغوا کیا تھا.... دراصل اغوا نہیں کیا تھا۔ وہ عورت اُس کے ساتھ خود جانا چاہتی

تھی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ خوش نہیں تھی۔"

"تمہاری طرح بدمعاش ہوگی" ـــ مَیں نے کہا۔

"ہاں حضور!" ـــ اُس کے مُنہ سے جیسے بے اختیار نکل گیا ـــ "وہ شریف عورت نہیں۔ ایک خاوند کے ساتھ وہ خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اُس کا یارانہ میرے دوست کے ساتھ تھا۔ وہ اُسے ساتھ لے گیا اور ایک اور گاؤں میں لے جاکر اپنے ایک دوست کے گھر رکھا۔ یہ آدمی جو عورت کو لے گیا تھا، میرے پاس آیا اور اس نے شکایت کی کہ وہ اُس عورت کو لینے گیا تو اُس کے دوست نے اسے اپنے گھر میں بھی داخل نہ ہونے دیا اور کہا کہ اُس کے پاس کوئی عورت نہیں۔ میرا دوست مجھے اپنے ساتھ لے گیا کہ چل کر تصفیہ کراؤ اور عورت مجھے واپس دلاؤ....

"اُس آدمی کو میں بھی جانتا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ چلا گیا۔ تین دن وہیں لگ گئے۔ دراصل اس عورت کو وہ آدمی زیادہ اچھا لگا تھا جس کے پاس اُسے میرا دوست چھوڑ آیا تھا۔ عورت نے میرے دوست کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ میرے دوست نے یہ جھگڑا کھڑا کر دیا کہ وہ آدمی اس عورت کی قیمت دے دے۔"

"ابوذر!" ـــ میں نے اُسے کہا ـــ "تم بھی یہی کام شروع کر دو۔"

"کون سا جناب!" ـــ اُس نے پوچھا۔

"عورتوں کی دلالی" ـــ میں نے کہا ـــ "عیش موج بھی کرو اور پیسہ بھی کماؤ.... چلو مان لیا، تم اس عورت کی دلالی کے لئے گئے تھے۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری ماں کا خصم مصطفےٰ کہاں ہے.... یہ تو میں تصدیق کراؤں گا ہی کہ تم اس عورت کے چکر میں وہاں گئے تھے۔"

"مَیں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں ملک صاحب!" ـــ اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "مَیں نے یہ سچ بتا دیا ہے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ یہ تو مجھے کل پرسوں پتہ چلا ہے کہ مصطفےٰ لاپتہ ہے۔"

"میرا خیال ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "کہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تم یہ بھی بتا دو گے کہ لڑکا کہاں ہے۔"

ہیڈ کانسٹیبل پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دے۔ ابوذر نے واویلا بپا کر دیا۔ اُس کا واویلا حوالات کے اندر جاکر ختم ہُوا۔

میں نے دو دن اور پوچھ گچھ میں گزار دیئے۔ تھانے کے دوسرے کام بھی کرتا رہا۔ اگلے روز دِلّی کے ایک تھانے کی چِٹھی آگئی جو وہاں کے اور میرے ہیڈکوارٹروں میں سے ہوتی ہوتی مجھ تک پہنچی تھی۔ تھانوں میں ایسی چِٹھیاں آتی رہتی ہیں۔ کہیں کا ملزم کہیں پکڑا جاتا ہے اور چِٹھیاں آنے جانے لگتی ہیں۔ میں اسے بھی معمول کی ایک چِٹھی سمجھا لیکن جس سے متعلق تھی اُس کا نام پڑھا تو میں یوں کُرسی پر اُچھلا جیسے کسی نے نیچے سے مجھے پِن چبھو دی ہو۔ نام مصطفےٰ تھا۔

چِٹھی میں لکھا تھا کہ مصطفےٰ ولد فلاں ذات فلاں سکنہ وغیرہ فلاں اس تھانے کے علاقے میں چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے اور اس نے ایسا بیان دیا تھا کہ وہاں کے تھانیدار کو چِٹھی لکھنی پڑی۔ وہ تصدیق چاہتا تھا کہ ملزم اسی جگہ کا رہنے والا ہے جو اُس نے لکھوائی ہے اور مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ یہ ملزم عادی جرائم پیشہ اور سزا یافتہ تو نہیں۔ میں نے اُسی وقت اپنے ڈی ایس پی کو بذریعہ ٹیلی فون بتایا کہ جو چِٹھی اُس نے میری طرف بھجوائی ہے یہ اُسی مصطفےٰ کے متعلق ہے جس کی گمشدگی کا کیس میرے پاس زیرِ تفتیش ہے۔ ڈی۔ایس۔پی نے حکم دیا کہ میں اپنے اے ایس آئی کو اُس کے پاس بھیج دوں۔

میں نے اے ایس آئی کو ایک کانسٹیبل دے کر بھیج دیا۔ یہ پولیس کے ضابطے کی دفتری کارروائیاں تھیں۔ میں نے مصطفےٰ کے چچا کو بتایا کہ مصطفےٰ دِلّی کے فلاں تھانے کی حوالات میں زندہ اور سلامت موجود ہے۔ میں نے اُسے دِلّی بھیجا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے کو شناخت کر کے مجھے بیان دے دے کہ اُس

کا بھتیجا مل گیا ہے لیکن میرا کام یہیں پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ کا بیان لینا لازمی تھا کہ وہ دلی کس طرح جا پہنچا۔ کیا اُسے کسی نے اغوا کر کے وہاں پہنچا دیا تھا یا وہ خود گیا تھا۔

اے ایس آئی کو حکم ملا کہ دلی جا کر مصطفیٰ سے بیان لے اور اُس کی گمشدگی کی رپورٹ دینے والے یعنی اُس کے چچا کو شناخت کے لئے ساتھ لے جاتے۔ اے ایس آئی، ایک کانسٹیبل اور مصطفیٰ کا چچا اُسی روز روانہ ہو گئے۔ دلی دُور تھی۔ ان لوگوں نے کم از کم چار روز بعد واپس آنا تھا۔ میں نے ان تمام افراد کو جنہیں میں نے مشتبہ بٹھا رکھا تھا، یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ وہ گھروں میں موجود رہیں اور طلبی پہ فوراً تھانے آجائیں۔ ابوذر کو بھی حوالات سے نکال کر گھر بھیج دیا۔

دلّی کی ایک گلی میں

چوتھے دن اے ایس آئی آگیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ مصطفیٰ کا بیان لے کر آئے گا لیکن وہ مصطفیٰ کو ساتھ لے آیا۔ میں نے پہلے تو مصطفیٰ کو پہچانا ہی نہیں۔ اُسے لاپتہ ہُوئے سترہ اٹھارہ دن ہو گئے تھے۔ اُس کے کپڑے مٹی جیسے تھے۔ سر کے بال بکھرے ہُوئے اور جُڑے ہوئے تھے۔ اُس کی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ چہرہ میلا اور مُرجھایا ہُوا تھا۔ وہ کوئی نیم پاگل یا بھکاری یا چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والا لگتا تھا۔ میں نے جب اُس کے ساتھ بات کی تو اُس کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔

کچھ وقت بعد اُس نے بیان دینا شروع کیا۔ اس بیان کی جو روح تھی وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ شفیقہ جب اپنے اغوا کے کیس کے بعد اپنے گاؤں چلی گئی تھی تو مصطفیٰ کو اتنا غم ہُوا تھا جتنا اُسے اپنی ماں کے مرنے کے بعد ہُوا تھا۔ اُسے ماں تو نہیں مل سکتی تھی۔ شفیقہ تک وہ پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ شفیقہ کے

گاؤں چلا گیا اور شفیقہ کے گھر رہا۔ اُسے یہ تو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ جوان آدمی ہے۔ وہ شفیقہ کے پاس جانے اور اُس کے پاس بیٹھنے کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا تھا۔

اُس کے بیان کے کئی حصّے آپ کو شفیقہ اور دوسروں کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ گھر میں اُس کا رہنا محال ہو گیا تھا۔ دونوں بہنیں اُسے طعنے دیتی تھیں۔ میں نے اس کہانی میں مصطفیٰ کے بڑے بھائی کا ذکر نہیں کیا۔ اُس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ مصطفیٰ کی گمشدگی کی رپورٹ دینے بھائی کی بجائے چچا آیا تھا کیونکہ اُس کا بھائی اتنا زیادہ بیمار ہو گیا تھا کہ اُس کے لئے اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ اُسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ وہ اس کیس کے چھ سات ماہ بعد مر گیا تھا۔

مصطفیٰ اس چکر میں آگیا تھا کہ اپنے گھر کا وہ شہزادہ ہُوا کرتا تھا مگر اب سارا گھر اُس کا دُشمن ہو گیا تھا۔ اُس کا بڑا بھائی ٹی بی کا مارا ہُوا، اُس کے ساتھ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ مصطفیٰ کو بڑے بھائی کی بیماری کا بھی غم تھا۔ اُسے شفیقہ کے گھر جا کر تسکین ملتی تھی۔ شفیقہ نے اُسے کہنا شروع کر دیا کہ اُس کا باپ اور بھائی وغیرہ اُس کا اُن کے گھر آنا اچھا نہیں سمجھتے۔ اس صدمے نے اُس کے دماغ پر اثر کیا۔

اُدھر اُس کی بیوی گُل نے اُسے محبت کے پیغام بھیجنے شروع کر دیئے اور ایک رات ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ مصطفیٰ نے مجھے سنایا کہ جس پاگل پن سے وہ محبت کا اظہار کرتی تھی یہ مصطفیٰ کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ گُل کی محبت کو وہ ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ اُس کی ضرورت دراصل محبت ہی تھی۔

آخر شفیقہ کے بھائیوں نے اُسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا اور ان میں ترش کلامی بھی ہوئی۔ دو تین روز پہلے رات کو مصطفیٰ کی ملاقات گُل سے ہوئی تھی۔ مصطفیٰ نے اُسے اپنے گھر لانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اُسے یہ خیال آیا کہ گھر میں تو اُس کے اپنے لئے جگہ نہیں رہی بیوی کو کہاں رکھے گا۔

وہ ناتجربہ کار تھا۔ ایسے طوفان کی لپیٹ میں آیا کہ شفیقہ کے گھر سے نکل کر اپنے گھر جانے کی بجائے دوسری طرف چل پڑا اور ریلوے سٹیشن جا پہنچا۔ اُس کے پاس پیسے تھے۔ اُس نے دِلّی کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے میں خواب میں چلتا پھرتا رہا ہوں" —— مصطفیٰ نے مجھے بیان دیتے ہوتے کہا —— "میں آوارہ پھرتا رہا۔ یہ سوچ آتی ہی نہیں تھی کہ جاؤں گا کہاں۔ مجھے کھانے پینے کی نہیں سکون کی ضرورت تھی۔"

وہ دو تین قصبوں میں گھومتا پھرتا رہا پھر خواجہ نظام الدینؒ اولیا کے مزار پر چلا گیا۔ وہاں بہت رویا۔ دو دن اور دو راتیں وہاں رہا۔ وہ دو اور مزاروں پر بھی گیا تھا۔ وہاں وہ روتا اور سکون مانگتا تھا۔ اُس کی ذہنی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہر کسی کو بھول گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں گھوم پھر رہا ہے۔

اس ذہنی حالت میں اُسے ایک رات شور سنائی دیا —— "چور۔ چور۔ پکڑو۔ وہ گیا" —— مصطفیٰ بیدار ہو گیا۔ وہ اُس وقت دِلّی کے کسی محلّے کی گلی میں جا رہا تھا۔ کچھ آدمی دوڑ رہے تھے۔ مصطفیٰ اُس وقت گلی مُڑ رہا تھا۔ آگے سے بھی دو تین آدمی آ گئے۔ انہوں نے مصطفیٰ کو ہی پکڑ لیا۔ اُس نے بہت واویلا بپا کیا کہ وہ چور نہیں لیکن دو تین آوازیں اُٹھیں کہ یہی تھا۔ سب اُسے مارنے پیٹنے لگے اور تھانے لے گئے۔ اُس نے تھانیدار کو بتایا کہ اُس نے چوری نہیں کی۔ وہ تو اُس گلی سے گزر رہا تھا۔

تھانیدار نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اُس نے اپنے شہر کا نام بتایا کہ وہ گھر سے کیوں بھاگ آیا ہے مگر اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ تھانے سے اُس کے اپنے شہر کے تھانے میں اُس کے متعلق چٹھی جا رہی ہے۔

جن کے گھر چوری ہوئی تھی وہ کہتے تھے کہ چور ایک اٹیچی کیس اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ جب وہ چور کے پیچھے دوڑے تو اٹیچی کیس

اُس کے ہاتھ میں تھا۔ مصطفیٰ کو پکڑنے والوں نے کہا کہ اُس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس نہیں تھا۔

جب میرا اے ایس آئی وہاں گیا تو دِلّی کے اس تھانیدار کو یقین ہو گیا تھا کہ مصطفیٰ کو ان لوگوں نے بے گناہ پکڑ لیا ہے۔ اُس نے وہ گلی دیکھی تھی۔ وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں مصطفیٰ اٹیچی کیس پھینک دیتا اور اٹیچی کیس کا سراغ نہ ملتا۔

تھانیدار نے مصطفیٰ کو چھوڑ دیا۔ اسے اے ایس آئی اور اپنا چچا دِلّی سے لے آتے۔ اس جھٹکے نے اُس کا دماغ درست کر دیا تھا۔ اب وہ ہوش اور عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔

میں نے کاغذی کارروائی مکمل کر کے سب کو چھٹی دے دی۔ تین چار ماہ بعد پتہ چلا تھا کہ مصطفیٰ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے آیا تھا لیکن الگ مکان میں رہتا تھا۔ ان کی زمین بہت تھی۔ وہ فصل سے اپنا حصہ لے لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس تھانے سے میرا تبادلہ ایک اور تھانے میں ہو گیا اس لئے معلوم نہیں ہو سکا کہ مصطفیٰ اور اُس کی بیوی کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔

قتل یوں بھی ہوتے ہیں

قتل کے متعلق میں پہلے کبھی بتا چکا ہوں کہ یہ ایک لمحے کا پاگل پن ہوتا ہے۔ اِس ایک لمحے یا ایک سیکنڈ میں انسان اپنے آپ کو قتل کر سکتا ہے یا کسی اور کو۔ جب یہ لمحہ گزر جاتا ہے تو قاتل کی جو ذہنی حالت ہوتی ہے وہ صرف پولیس والے دیکھتے ہیں۔ اس ایک لمحے کے پیچھے کوئی حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے یا کوئی اور ہی ڈرامہ ہوتا ہے جس کے اثرات اندر ہی اندر کام کر رہے ہوتے ہیں۔

قتل کے پیچھے نفسیاتی عوامل بھی ہو سکتے ہیں اور کسی خطّے کی روایات بھی۔ میں آپ کو سرگودھا کے علاقے کے دو جوان آدمیوں کا مختصر سا واقعہ سُناتا ہوں۔ وہ آپس میں سالا بہنوئی تھے اور دونوں تعلیم یافتہ۔ ایک گاؤں کے رہنے والے خوشحال زمیندار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے ایک آدمی کو نہایت معمولی سی بات پر قتل کر دیا اور انہیں عمر قید ہوئی۔ انہوں نے قتل کی وجہ یہ بیان کی کہ اُن کی برادری کے دو بھائیوں نے گاؤں کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا اور اُنہیں عمر قید ہوئی تھی۔ اُن کے گھر والے گاؤں میں ڈھینگیں مارتے پھرتے تھے کہ اُن کے لڑکوں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ اسے وہ ایسا کارنامہ کہتے تھے جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔

میں جس سالے بہنوئی کی بات سُنا رہا ہوں، وہ اِن کی ڈھینگیں برداشت نہ کر سکے حالانکہ مقتول کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو قتل کر کے یہ ثابت کریں کہ ہم بھی قتل کر سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسی معمولی بات پر جس پر لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہُوا کرتا، ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ انہیں جب عمر قید سنائی گئی تو وہ خوش تھے کہ انہوں نے برادری میں نام پیدا کر لیا ہے اور اب اُن کے "شریک" یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ قتل صرف وہی کر سکتے ہیں۔

کسی بھی تھانیدار سے قتل کی وارداتیں سُنیں تو ان میں بعض وارداتیں ایسی ہوں گی جن پہ آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک سنسنی خیز کہانی ہے جو اس تھانیدار نے خود ہی گھڑ لی ہے۔ ایسی سچی کہانیاں میرے پاس بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے "قتل یوں بھی ہُوا کرتے ہیں"۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ قتل کرنے والے وحشی اور آدم خور یا پیشہ ور جلاد نہیں ہُوا کرتے۔ وہ ہم سب جیسے انسان ہوتے ہیں۔ پھر وہ کس طرح انسان کی جان لے لیتے ہیں؛ اس سوال کا جواب میم۔ الف سے پوچھیں۔ میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ قتل ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ میرا تھانہ چار ساڑھے چار میل دُور قصبے میں تھا اور یہ گاؤں میرے تھانے میں آتا تھا۔ اس میں ہندو اور سکھ بھی آباد تھے لیکن اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ سب کاشتکار تھے۔ تین برادریاں بڑی زمینداری والی تھیں۔ بعض درمیانہ درجے کے اور کچھ اس سے کم درجے کے زمیندار تھے۔

صبح نمبردار، چوکیدار اور دو تین اور آدمی اطلاع لاتے کہ گاؤں سے پانچ چھ فرلانگ دُور ٹیلوں میں گاؤں کے ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔ اُس کی عمر بتیس تینتیس سال بتائی گئی۔ اُس کے رشتہ داروں میں سے اُس کا ایک چچا اور ایک یا شاید دو چچازاد بھائی تھانے آتے تھے۔

میں نے لاش کی حالت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ چہرہ، گردن اور کندھے صحیح حالت میں ہیں، پیٹ پھٹا ہُوا اور اندر سے سب کچھ کھایا ہُوا ہے۔ میں اُن سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ لاش پر زخموں اور ضربوں کے نشان ہیں یا نہیں۔ اُنہوں نے لاش کی جو حالت بتائی اس میں ممکن نہیں تھا کہ زخم نظر آتے۔

میں موقعہ پر گیا۔ وہ جگہ کھُروں کے لئے موزوں تھی۔ مٹی اور دُھول تھی لیکن لوگوں نے کھُرے نہیں رہنے دیئے تھے۔ رات کو آندھی بھی چلی تھی۔ مٹی اتنی اُڑی تھی کہ کھُرے دب گئے۔ وہ جگہ اور ارد گرد خاصا علاقہ ویران تھا۔ آندھی نہ چلتی تو موقعۂ واردات سے دُور جہاں تک لوگ نہیں پہنچے تھے، کھُرا مل ہی جاتا۔

لاش پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ میں نے چادر ہٹا کر دیکھا۔ لاش کی حالت اُس سے زیادہ بُری تھی جو مجھے بتائی گئی تھی۔ چہرہ، گردن، کندھے، سینے کا اُوپر کا حصہ ٹھیک حالت میں تھے۔ اس سے نیچے گیدڑوں، لومڑیوں اور شاید بھیڑیوں نے بھی لاش کا زیادہ تر گوشت کھا لیا تھا۔

گردن پر خون جما ہُوا تھا۔ میں نے لاش کو اُلٹا کرایا تو گردن کٹی ہوئی لگی۔ گردن کے کچھ پیچھے اور دائیں طرف گہرا کٹ تھا۔ یہ کلہاڑی، تلوار یا ٹوکے کا تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر اس کٹ سے ذرا اُوپر ایسا ہی ایک اور زخم تھا۔ اس پر بال تھے اور خون بھی جما ہُوا تھا اس لئے یہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ یہ زخم کتنا لمبا ہے اور کیا کھوپڑی بھی کٹی ہوئی ہے یا نہیں۔

اگر گردن اور سر پر یہ دو زخم نہ ہوتے تو موت کا باعث معلوم کرنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہو جاتا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ کہا جا سکتا تھا کہ یہ شخص چلتے چلتے کسی اور وجہ سے مر گیا اور گیدڑوں وغیرہ نے اسے کھا لیا لیکن اس لاش کا معاملہ بالکل صاف تھا۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔

میں نے وہاں جو کاغذ تیار کرنا تھا وہ کیا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کیا۔ لاش کے ارد گرد زمین پر کوئی کھُرا تو نہیں تھا لیکن یہ پتہ چلتا تھا کہ مقتول تڑپتا رہا ہے۔ خون دو تین گز دُور دُور بکھرا ہُوا تھا۔ مٹی لال تھی۔ مقتول دیہاتی جوان تھا۔ اُس کے جسم میں اتنا خون تھا جو آجکل اس عمر کے چھ آدمیوں میں بھی نہیں ہوتا۔

ارد گرد زمین پر بہت دیکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو بھی اس

کام پر لگا دیا کہ مٹی ہٹا ہٹا کر دیکھیں، شاید کوئی چیز مل جائے جو سراغرسانی میں مدد دے سکے۔

کچھ بھی نہ ملا۔ وہ علاقہ اس طرح تھا کہ زمین گہرائی میں تھی۔ اِدھر اُدھر ٹیلے تھے اور ٹیکریاں بھی تھیں اور کہیں سے زمین کٹی پھٹی تھی۔ کہیں گھاس تھی، کہیں خشک سرکنڈے اور زیادہ تر زمین خشک اور بنجر تھی۔ اس میں سے تنگ سا راستہ گزرتا تھا۔ ایک طرف، موقعۂ واردات سے تقریباً ڈیڑھ سو گز دُور برساتی نالہ تھا۔ اس میں کہیں کہیں رُکا ہُوا پانی تھا۔ میں نے وہاں جا کر بھی دیکھا۔ قاتل نے آلۂ قتل اس پانی میں دھویا ہوگا۔ میں اس اُمید پر وہاں گیا تھا کہ شاید کوئی نشان یا کھُرا مل جائے لیکن وہاں بھی کچھ نہ ملا۔

میں گاؤں میں چلا گیا۔ نمبردار نے بڑی تیزی سے چوپال میں پلنگ رکھوا دیا۔ چھوٹی سی میز اور دو تین کُرسیاں بھی لے آیا۔ میں نے مقتول کے باپ اور بھائیوں کو بُلانا تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ اُس کی اکیلی ذات تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ دونوں مر گئے تھے۔ وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اُس کا ایک چچا اور اُس کے دو یا تین بیٹے تھے۔ میں نے نمبردار کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی تھی؟

منہ بولے بہن بھائی؟

”خاندانی دُشمنی تو نہیں تھی، خاندانی جھگڑا تھا“ — نمبردار نے جواب دیا — ”مقتول کی اپنے چچا کے ساتھ زمینیں مشترک تھیں۔ ایک سال ہُوا ان میں تقسیم ہوئی تھیں۔ مقتول کو شکایت تھی کہ چچا نے اُس کا کچھ حصہ مار لیا ہے۔ اس پر ان کا جھگڑا رہتا تھا۔“

”ان کی آپس میں کبھی لڑائی ہوتی تھی؟“

”زبانی“ — نمبردار نے جواب دیا — ”لڑائی نہایت معمولی سی ہوتی

تھی۔ ویسے ہی ہاتھا پائی سمجھ لیں۔ مقتول اکیلا تھا۔ اُس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسری طرف چچا اور اُس کے تین بیٹے تھے۔ مقتول ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مقتول نے اِن لوگوں کے ساتھ پھر جھگڑا مول لے لیا ہو اور اُنہوں نے اسے قتل کر دیا ہو؟"

"اگر جھگڑا ہُوا ہوتا تو گاؤں میں سب کو نہیں تو کسی کو تو پتہ چلتا" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "میں گاؤں کی پوری خبر رکھتا ہوں۔ ان میں کوئی تازہ جھگڑا نہیں ہُوا۔"

"مقتول کے چچازاد بھائی کیسے ہیں؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کیا وہ قتل کرنے کی ہمت رکھتے ہیں؟"

"اس خاندان میں کبھی ایسی واردات نہیں ہوتی" ـــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "لیکن دوسرے کے دل کی باتیں کون بتا سکتا ہے .... ایک اور آدمی پر غور کریں۔ اُس کا نام قیوم ہے۔ جوان آدمی ہے۔ عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ وہ مقتول کے گھر ہر روز جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیوم منظور (مقتول) کی بیوی کی خاطر اُس کے گھر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قیوم کے منظور کی بیوی کے ساتھ تعلقات ہیں اور یہ کہنے والے بھی ہیں کہ قیوم بُری نیت سے منظور کے گھر نہیں جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مُنہ بولے بہن بھائی ہیں۔ مقتول کی بیوی قیوم سے چار پانچ سال بڑی ہے۔"

"قیوم شادی شدہ ہے؟"

"نہیں" ـــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "اُس کی عمر اسی طرح گزرے گی۔ اُسے کسی لڑکی کا رشتہ نہیں مل سکتا۔ ایک رشتہ ملا تھا لیکن قیوم نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "رشتہ کیوں نہیں مل سکتا؟"

"ظاہری طور پر ٹھیک رہتا ہے" ـــ نمبردار نے بتایا ـــ "لیکن اُس

کے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔ کبھی کبھی اکیلا بیٹھا باتیں کرتا ہے۔ ہنستا بھی ہے لیکن اُس کی یہ حالت زیادہ دیر نہیں رہتی۔ تھوڑا عرصہ گزرتا ہے تو باقاعدہ نمازی بن جاتا ہے۔ مسجد میں نمازیں پڑھتا ہے اور جہاں دو چار آدمی اکٹھے بیٹھے یا کھڑے دیکھے، ان میں جا پہنچتا اور مولویوں کی طرح وعظ شروع کر دیتا ہے۔ لوگوں کو قیامت کے حساب کتاب سے اور دوزخ سے ڈراتا ہے....

"یہ سلسلہ دس دن یا بارہ دن چلتا ہے پھر نمازیں ایسی چھوڑتا ہے کہ مسجد کے قریب سے بھی نہیں گزرتا۔ لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تم دوسروں کو دوزخ سے ڈراتے ہو، تم خود دوزخ سے کیوں نہیں ڈرتے؟ وہ اس کے جواب میں چُپ رہتا ہے یا ویسے ہی کوئی جواب دے دیتا ہے۔ اُس کا باپ ہے، تین بھائی ہیں، دو بہنیں ہیں۔ ان کی زمینداری لمبی چوڑی ہے۔ چوبارہ ہے۔ ذات اُونچی ہے۔ روپیہ پیسہ ہے۔ عزت والا خاندان ہے۔ گھر والوں نے اسے کھُلی چھُٹی دے رکھی ہے۔ زمینیں مزارعوں کے پاس ہیں۔"

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ قیوم کے مقتول کی بیوی کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلقات ہیں؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "میں صرف شک اور شبہے کی بات نہیں سُننا چاہتا۔"

"وہ مقتول کی موجودگی میں بھی اُس کے گھر جاتا تھا" ـــ نمبردار نے کہا ـــ "میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھی کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے قیوم کو باہر کہیں منظور کی بیوی کے ساتھ دیکھا ہو۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قیوم نے مقتول کو دوست بنا رکھا تھا" ـــ میں نے کہا۔

"یہ بات بھی نہیں" ـــ نمبردار نے کہا ـــ "میں نے منظور کو کہا تھا کہ اس شخص کے ساتھ اتنی گہری دوستی نہ رکھو۔ پگلا سا ہے۔ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے گا۔ ویسے بھی لوگ باتیں بناتے ہیں .... منظور نے پریشان سا ہو کر مجھے کہا کہ میں نے اُسے دوست نہیں بنایا۔ آتا ہے اور میرے پاس

بیٹھ جاتا ہے۔ باتیں بڑی شرافت کی کرتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ بات نہیں کرتا لیکن وہ مجھ سے بات کر والیتا ہے۔ منظور نے یہ بھی کہا کہ قیوم میری بیوی کو دیکھتا رہتا ہے۔"

"اُس کی بیوی کا قیوم کے ساتھ رویّہ کیا ہوتا ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"منظور نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی بیوی قیوم کے ساتھ کوئی بات کر لیتی ہے" ــــ نمبردار نے جواب دیا ــــ "دراصل بات یہ ہے جی، کہ منظور قیوم کے خاندان کے مقابلے میں کمزور تھا اور اکیلا بھی تھا۔ اس وجہ سے وہ قیوم کو گھر سے نکال نہیں سکتا تھا.... اس میں کوئی شک نہیں کہ قیوم کے منظور کی بیوی کے ساتھ تعلقات چاہے کیسے بھی ہیں، وہ اس عورت کا عاشق ہے۔ وہ اپنے گھر کا کوئی کام نہیں کرتا لیکن منظور یا اُس کی بیوی اُسے جو کہیں وہ کرتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ نوکروں کی طرح اُن کا کام کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اس سے کام ہی لیتے رہتے ہوں۔"

"مقتول کے بچے کتنے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں" ــــ نمبردار نے جواب دیا ــــ "شادی کو دس سال ہو گئے ہیں، ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔"

یہ بات سُنی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ دس سال میں اولاد نہ ہوئی۔ قیوم ان کے گھر جاتا ہے۔ خاوند (مقتول) کو یہ بھی معلوم ہے کہ قیوم اُس کی بیوی کو دیکھتا رہتا ہے لیکن مقتول میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ قیوم کا اپنے گھر میں داخلہ بند کر دیتا۔ دیہاتی معاشرے میں یہ کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا جو مقتول برداشت کرتا رہا۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت تو دیہات میں بہت ہی سختی تھی۔ انہی باتوں پر اور محض شک و شبہے میں ہی خون خرابے ہو جایا کرتے تھے۔

میں نے اس صورتِ حال سے یہ رائے قائم کی کہ مقتول بُزدل اور ڈھیلا ڈھالا سا آدمی تھا اور اس وجہ سے اُسے بیوی پسند نہیں کرتی تھی۔ بیوی قیوم کو چاہتی تھی اور قیوم اس عورت پر مرتا تھا۔ دونوں نے مقتول کو راستے

سے ہٹانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُسے قیوم نے قتل کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتول نے قیوم کو اپنے گھر میں آنے سے روکا ہو گا۔ قیوم کا دماغ پہلے ہی خراب تھا۔ اُس نے مقتول کو ختم کر دیا۔

جسم کشش والا تھا

میں نے نمبردار سے قیوم کے متعلق مزید معلومات لیں۔ پھر میں نے ذیلدار سے اور ایک سفید پوش سے اور ایک اور آدمی سے جو تھانے میں میرے سلام کو آیا کرتا تھا، قیوم کے متعلق کرید کرید کر پوچھا۔ ان سب نے جو بیان دیئے وہ نمبردار کے بیان کی تائید کرتے تھے۔ میں نے سب سے پوچھا کہ قیوم پر قتل کا شک کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ سب نے کہا تھا کہ وہ جرأت والا ہے اور اُس کے دماغ پر بھی کوئی اثر ہے، اُس پر قتل کا شُبہ کیا جا سکتا ہے۔

ان میں سے دو آدمیوں نے کہا تھا کہ مقتول کی بیوی اگر اسے یہ کہہ دے کہ فلاں آدمی کو یا میرے خاوند کو قتل کر دو تو وہ اُس عورت کا حکم بجا لائے گا۔

اُس کے عام چال چلن کے متعلق سب نے کہا کہ اتنے امیر اور اتنی بڑی زمینداری والے خاندان کا ہو کر بھی اُس نے کبھی کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور کسی نے کبھی اُس کے خلاف ایسی شکایت نہیں کی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اُس کے ہم عمر اُس کے ساتھ مذاق اور چھیڑ خانی کرتے ہیں لیکن وہ خفا نہیں ہوتا۔

"اُس کی دماغی خرابی پیدائشی ہے یا بعد میں کچھ ہُوا تھا؟"

"بعد میں!" ــــ ذیلدار نے جو بہت بوڑھا ہو چکا تھا جواب دیا ــــ "بارہ تیرہ سال کی عمر تک یہ بالکل ٹھیک تھا۔ اُس کی چھوٹی بہن جو آٹھ نو سال کی تھی، مر گئی۔ قیوم گلیوں میں روتا پھرتا تھا۔ کئی بار اُسے قبرستان سے بہن کی قبر سے اُٹھا کر لاتے تھے۔ جب کبھی ایسا ہوتا تھا تو وہ چیختا چلاتا تھا کہ مجھے اس قبر میں دفن کر دو۔ مجھے اِس قبر میں دفن کر دو۔ دو اڑھائی سال بعد اُس کی ماں مر گئی۔ اُس کی یہ

حالت ہوگئی کہ چُپ چاپ بیٹھا رہتا اور ہر طرف اور ہر کسی کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے اُس کی بینائی ختم ہو گئی ہو۔ اُس کی آنکھ میں آنسو آتا ہی نہیں تھا۔ اُس کی بہنوں نے، بھائیوں نے، باپ نے اُس کے ساتھ بہت پیار کیا لیکن اُس کی یہی حالت رہی کہ خاموش بیٹھا رہتا یا خاموشی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا تھا۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ ایک بار بھی قبرستان میں نہیں گیا۔"

مجھے بتایا گیا کہ جوانی میں آکر یعنی سترہ اُٹھارہ سال کی عمر میں قیوم نے بولنا شروع کیا لیکن اُس کی بعض حرکتیں پاگلوں جیسی تھیں پھر وہ بالکل ٹھیک نظر آنے لگا۔ باتیں کرتا تھا، سُنتا بھی تھا لیکن کوئی بات اور کوئی حرکت ایسی کر دیتا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کا دماغی توازن صحیح نہیں۔

ان سب میں سے دو آدمیوں نے یقین کے ساتھ کہا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ قیوم کے مراسم قابلِ اعتراض تھے اور ان دونوں نے مقتول کو دھوکے میں رکھا ہُوا تھا۔ میں نے توجّہ قیوم پر ہی مرکوز کر لی۔ اُس کی دماغی خرابی سے میرا شک پختہ ہوتا تھا۔

ابھی تو میں نے خفیہ مخبروں سے رپورٹیں لینی تھیں۔ میں نے اب تک جن افراد کے بیان لئے تھے وہ سب قیوم کی ذات کے تھے۔ میں نے قیوم سے پہلے مقتول کی بیوی سے پوچھ گچھ بہتر سمجھی۔ اُسے بلایا۔ پہلے تو میں نے یہ دیکھنا تھا کہ اپنے خاوند کی موت کا اُسے کتنا غم ہے اور اگر غم ہے تو یہ دکھاوے کا ہے یا صحیح معنوں میں غم ہے۔

وہ میرے سامنے آئی تو اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی اور ناک سُرخ تھی۔ اُس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ گورے رنگ کی عورت نہیں تھی۔ رنگ ہلکا سانولا تھا۔ البتہ چہرے کے نقش اچھے تھے۔ آنکھیں موٹی تھیں۔ سُوجی ہُوئی ہونے کے باوجود اچھی لگتی تھیں اور اُس کا قد اور جسم کشش والا تھا۔

میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں۔ افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اُسے کس پر شک ہے۔

اُس نے سَر زور زور سے ہلا کر کہا ۔۔۔ "پتہ نہیں۔ میں نہیں جانتی یہ کیا ہُوا ہے۔"

"ایسا کون سا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"ایسا دشمن تو کوئی بھی نہیں تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ دُشمنی رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔"

میں اس عورت کی جذباتی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے الفاظ بہت تھوڑے اور سسکیاں اور ہچکیاں زیادہ نکلتی تھیں۔ اس کیفیت میں اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ غصّے اور انتقام کی شدّت کی وجہ سے مُنہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو تفتیش کرنے والے کو ملزموں تک آسانی سے پہنچا دیتی ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ گواہ یا مشتبہ اس جذباتی کیفیت میں غلط باتیں بھی کہہ دیتا ہے یا بڑھا چڑھا کر بات کرتا ہے جس سے تفتیشی افسر گمراہ ہو جاتا ہے۔ گواہ یا مُشتبہ جب کچھ دنوں بعد اپنے آپ میں آتا ہے تو وہ اپنی کہی ہوئی غلط بات پر ہی اڑا رہتا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ عورت بیان دینے کے قابل نہیں اور اگر میں نے اس پر زیادہ دباؤ ڈالا تو یہ کوئی نہ کوئی غلط بات کہہ جائے گی اور اس کے بعد اسے صحیح بات پر لانا مشکل ہو جائے گا۔

میں بڑی غور سے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی یہ جذباتی حالت اور اس کا اس طرح رونا قدرتی ہے یا مجھ پر جعلی عکس ڈال رہی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق اس عورت کا اتنا زیادہ غم قدرتی تھا اور اسے واقعی اپنے خاوند کی موت کا غم تھا۔ میں نے اُن عورتوں کا رونا بھی دیکھا تھا جنہوں نے اپنے خاوندوں کو اپنے ہاتھوں زہر دیا یا اپنے آشناؤں سے مروایا تھا۔

میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے بعد میں شاملِ تفتیش کروں گا، فی الحال اس سے کچھ ابتدائی اور ضروری باتیں پُوچھ لوں۔

"منظور گھر سے کس وقت نکلا تھا؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"شام کو گھر سے نکلا تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"کچھ بتا کر نہیں گیا تھا کہاں جا رہا ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا وہ شام کو اسی طرح ہر روز باہر جایا کرتا تھا؟"

"کبھی کبھی" — اُس نے جواب دیا — "لیکن اُس نے مجھے کبھی بتایا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔"

"تمہیں معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں جایا کرتا تھا" — میں نے کہا — "دوستوں یاروں میں جا بیٹھتا ہوگا..... وہ جوا تو نہیں کھیلتا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ جوا نہیں کھیلتا تھا۔ اُس میں کوئی اور بُری عادت بھی نہیں تھی۔"

"آمنہ!" — میں نے اُسے کہا — "تمہارا خاوند قتل ہو گیا ہے اور یہ میرا فرض ہے کہ میں قاتل کو پکڑوں۔ میری جتنی مدد تم کر سکتی ہو اتنی اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ قاتل پکڑا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں اپنے فرض کو بھول جاؤں۔ میں نے تو ہر قیمت پر قاتل کو پکڑنا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی راز کی بات ہے تو وہ ابھی بتا دو۔ اگر یہ بات مجھے کسی دوسرے سے معلوم ہوئی تو تم پھنس جاؤ گی۔ اس وقت کچھ بتا دو گی تو میں پردہ ڈال دوں گا۔ آج کا دن گزر گیا تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا۔"

"آپ حاکم ہیں" — اُس نے کہا — "جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ میں آپ کو ٹوک نہیں سکتی۔ یہ ضرور کہوں گی کہ آپ نے یہ غلط کہا ہے کہ میں اپنے خاوند کے قاتل کو شاید نہیں پکڑوانا چاہتی۔ میں نے آپ کو پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہیں یہ کیا ہو گیا ہے، کس نے کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے آمنہ!" — میں نے کہا — "تم ابھی بیان دینے کے قابل نہیں۔ تمہیں بہت بڑا دُکھ پہنچا ہے۔ ابھی رہنے دو۔ گھر جاؤ اور خاوند بے چارے کے کفن دفن کے بعد تمہیں بلاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ اُس وقت تم کوئی بات کہنے اور سُننے کے قابل ہو جاؤ گی .... صرف ایک بات بتا دو...

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ منظور نے کسی اور عورت کے ساتھ تعلق پیدا کر رکھا ہو اور اُس عورت کے رشتہ داروں نے انہیں کہیں دیکھ لیا ہو؟"

"نہیں" — آمنہ نے جواب دیا — "وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔"

"کیا یہ بات تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو؟"

"میں اُس کے ساتھ تو باہر نہیں جاتی تھی" — اُس نے کہا — "اگر باہر وہ کچھ کرتا تھا تو مجھے کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ میں اُس کی عادت بتا رہی ہوں کہ وہ اس قسم کی حرکتیں کرنے والا نہیں تھا۔"

میرے پوچھنے پر اُس نے تین آدمیوں کے نام بتائے جو مقتول کے گہرے دوست تھے۔ میں نے ان تینوں کو بلا لیا۔

بے اولاد عورت

ان تینوں کو اپنے سامنے اکٹھے ہی بٹھا لیا اور کہا کہ ان میں سے جو سب سے زیادہ مقتول کا گہرا دوست تھا میرے پاس بیٹھا رہے۔

"تمہارا بڑا عزیز دوست قتل ہو گیا ہے" — میں نے انہیں کہا — "اگر تمہارے دل میں دوستی کا کچھ خیال ہے تو مجھے کوئی راستہ دکھاؤ تاکہ میں قاتل کو پکڑ سکوں۔"

ان میں سے دو نے ایک کی طرف دیکھا۔ دونوں نے اُسے کہا کہ مقتول اُس کا اتنا گہرا دوست تھا کہ اُس کے ساتھ دل کی باتیں بھی کیا کرتا تھا۔

"کیوں بھائی!" — میں نے اُس سے پوچھا — "کیا یہ ٹھیک کہتے ہیں؟"

"ہاں جناب!" — اُس نے کہا — "مجھ سے پوچھیں۔ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ بالکل ٹھیک بتاؤں گا۔"

میں نے دوسرے دونوں کو کہا کہ وہ ذرا باہر بیٹھیں۔

"تمہارا بڑا پیارا دوست قتل ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "جب

تمہیں اُس کے قتل کی اطلاع ملی تو تم نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ وہ کس وجہ سے قتل ہُوا ہے اور قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو بڑی قدرتی بات ہے جناب!" — اُس نے کہا — "لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ منظور ایسا آدمی تھا کہ دشمنی کو دل میں دبا لیتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ ہو۔"

"تمہاری بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس کے کوئی دشمن تھے" — میں نے کہا — "تم بتا سکو گے کہ وہ کون ہیں؟"

"اتنی گہری دشمنی تو کسی کے ساتھ نہیں تھی" — اُس نے کہا — "آپ بہت بڑے تھانیدار ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قتل انتقام کی وجہ سے کیا جاتا ہے یا کسی کے خلاف دل میں اتنی نفرت بیٹھ جاتی ہے کہ وہ برداشت سے باہر ہو جائے .... منظور میرے ساتھ ایک ہی آدمی کی باتیں کیا کرتا تھا اور اُس کے دل میں اس آدمی کی دشمنی بیٹھ گئی تھی .... یہ اُس کا چچازاد بھائی ہے۔ وہ تین بھائی ہیں۔ یہ درمیانہ ہے۔"

"اُس کے ساتھ دُشمنی کیا تھی؟"

"سب سے بڑی دشمنی تو زمینوں کی تقسیم پر شروع ہوئی تھی" — اُس نے بتایا — "یہ سب جانتے ہیں کہ منظور کی زمین کا کچھ حصہ ان لوگوں نے دھاندلی سے مار لیا تھا۔ منظور نے اپنے چچا کو بتایا تھا۔ چچا مان گیا تھا کہ منظور ٹھیک کہتا ہے۔ اُس کا بڑا چچازاد بھائی بھی مان گیا تھا، لیکن یہ بھائی جس کا نام رشید ہے مرنے مارنے پر اُتر آیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا نھنے خان اور رعب داب والا سمجھتا ہے۔ اپنے بھائیوں پر بھی اُس کا اثر ہے۔ اس اثر کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی بات کی مخالفت کرو تو گلے پڑ جاتا ہے۔ اُس نے اپنے باپ کو اور بھائیوں کو اپنے حق میں اور منظور کے خلاف کر دیا....

"منظور اپنے یہ دُکھڑے مجھے سناتا رہتا تھا۔ ان کے دادا کا ایک باغ ہے جس میں سبزیاں اُگاتے ہیں اور بڑی آمدنی ہو جاتی ہے۔ منظور کہتا تھا کہ

یہ باغ مجھے دے دو اور اس کے بدلے جتنی زمین مانگتے ہو لے لو۔ منظور نے مجھے بتایا تھا کہ یہ باغ دراصل اُس کے باپ نے بنایا اور پھیلایا تھا۔ کنواں بھی اُسی نے کھدوایا تھا۔ رہٹ بھی اُسی نے لگوایا تھا اور اُس نے اس باغ پر محنت بھی کی تھی اور ذاتی خرچ کیا تھا۔ اُس کی شرافت یہ تھی کہ چونکہ زمینیں ابھی مشترک چلی آ رہی تھیں اس لئے وہ باغ کی آمدنی منظور کے چچا کے ساتھ برابر تقسیم کر لیتا تھا۔ باپ مر گیا تو اسے منظور نے سنبھال لیا۔ رشید نے بھی باغ میں جانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ باغ پر قبضہ کر لیا....

"منظور کی مجبوری یہ تھی کہ اکیلا تھا۔ اس کے بھی دو تین بھائی ہوتے تو کوئی اُس کا حق مارنے کی جرأت نہ کرتا۔ یہ بیچارہ چُپ کر کے باغ سے الگ ہو گیا۔ رشید اپنے آپ کو بدمعاش سمجھتا تھا۔ باغ پر تو اُس نے قبضہ کر لیا تھا لیکن منظور کو اُس نے طعنے کے لہجے میں کئی بار کہا کہ یہ باغ اُس کی ذاتی ملکیت ہے۔ وہ منظور کو اسی طرح جلاتا رہتا تھا۔"

مقتول کا یہ دوست خاصا عقل مند تھا اور پوری خود اعتمادی سے بات کرتا تھا۔ یہ بڑے زمیندار خاندان کا جوان آدمی تھا۔ مجھے امید سی نظر آئی کہ یہ شخص کوئی نہ کوئی سراغ نکال دے گا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ مظلوم تو مقتول تھا۔ حق اُس کا مارا گیا تھا اور یہ برداشت کر کے الگ بیٹھ گیا تھا۔ پھر یہ قتل کیوں ہو گیا؟ اگر دشمنی زمین کی تقسیم پر ہی تھی تو قتل رشید کو اور قاتل منظور کو ہونا چاہئے تھا۔ میں نے اپنا یہ خیال منظور کے اس دوست کو بتایا۔

"جناب!" — اُس نے کہا — "خدا کی باتیں تو خدا ہی جانتا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اُس کی کوئی اگر عداوت تھی تو وہ کس کے ساتھ تھی اور کس وجہ سے تھی۔ آپ پولیس کے حاکم ہیں۔ جو عقل آپ میں ہے وہ مجھ میں نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کو تھوڑی سی روشنی دکھا رہا ہوں.... میں آپ کو بتا رہا تھا کہ رشید منظور کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ دو تین دفعہ منظور ذرا سیدھا ہُوا۔ اُس نے رشید سے کہا کہ میں خاندان کی عزت کی خاطر چپ رہتا ہوں۔ اگر تم نے زبان بند نہ کی تو میں تمہاری زبان بند کر کے دکھا دوں گا۔ ان دونوں میں لڑائی

ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ میں نے ایک بار رشید کے ساتھ یہی بات کی تھی کہ منظور تمہاری ہر اونچ نیچ برداشت کرتا ہے اور تم اُس کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھتے تو وہ کہنے لگا کہ معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ منظور مجھے بہت بُرا لگتا ہے....

"ایک دفعہ تو میں نے منظور سے کہا تھا کہ رشید کو کہیں الگ لے جا کر اس کی مار پٹائی کرتے ہیں لیکن منظور دشمنی کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا.... پھر ایک وجہ اور پیدا ہو گئی۔ برادری کے ایک خاندان نے منظور کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا۔ بات پکّی ہو گئی۔ منظور نے لڑکی کے لئے انگوٹھی اور کپڑے بھی بھیج دیئے تھے۔ آٹھ دس دنوں بعد انگوٹھی بھی واپس آ گئی، کپڑے بھی واپس آ گئے اور ساتھ یہ جواب آیا کہ منگنی کو منسوخ سمجھا جائے۔ وہ بڑی خوب صورت لڑکی تھی....

"دو تین دنوں بعد ہی لڑکی والوں نے رشتہ رشید کو دے دیا۔ ہم نے ٹوہ لگائی کہ یہ کس طرح ہُوا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ ساری بدمعاشی رشید کی تھی۔ رشید کی شادی ہوئی تو منظور بُلانے کے باوجود نہیں گیا تھا۔ رشید نے دو تین بار منظور کو طعنے دیئے تھے کہ اُس نے منظور کی منگیتر اُس سے چھین لی ہے۔ منظور کو فوراً ہی دوسرا رشتہ مل گیا۔ یہ آمنہ تھی۔ ان کی شادی ہو گئی۔"

"آمنہ چال چلن کے لحاظ سے کیسی عورت ہے؟"

"جناب!" اُس نے ہنس کر کہا — "اگر آپ یہی بات رشید سے پوچھیں تو وہ جواب دے گا کہ آمنہ بدچلن عورت ہے اور وہ آپ کو اس کی بدچلنی کی تین چار ... ٹے موٹ کی کہانیاں سُنا دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آمنہ نیک چلن عورت ہے۔"

"یہ قیوم کا کیا چکّر ہے؟"

"کوئی چکر نہیں تھا جناب!" — اُس نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا — "سچ پوچھیں تو اس پر مجھے بھی اعتراض تھا کہ ایک جوان آدمی کا اس طرح گھر میں آنا جانا اور اتنی اتنی دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ اس پر نہ منظور کو اعتراض تھا نہ آمنہ کو۔"

"مَیں کچھ اور معلوم کرنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "آمنہ کے ساتھ قیوم کا تعلق کیسا تھا؟"

"جناب، یہ تعلق ایسا ویسا ہوتا تو گاؤں میں ایک تماشہ ہو چکا ہوتا" — اُس نے کہا — "منظور شریف آدمی تھا، بے غیرت تو نہیں تھا۔ خود آمنہ بڑے اچھے اخلاق کی عورت ہے۔ اُس کے اخلاق کی ایک مثال آپ کو سناتا ہوں۔ دس سال گزر گئے ہیں۔ آمنہ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ بے اولاد عورتیں اولاد کے لئے کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ اُس نے بھی کئی مزاروں کے پھیرے کئے ہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس بھی جاتی رہی ہے۔ خود بھی اُس نے وظیفے اور چلّے کئے ہیں لیکن اُس کی مُراد پوری نہیں ہوئی....

"چار پانچ روز پہلے کی بات ہے کہ یہ کسی کے بتانے پر گامے شاہ کے گھر چلی گئی۔ معلوم نہیں آپ جانتے ہیں یا نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گامے شاہ اندر سے کیا ہے۔ اُس کے پاس جو عورتیں جاتی ہیں وہ بھی موج میلے کی شوقین ہوتی ہیں۔ انہی عورتوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گامے شاہ بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتا ہے۔ آمنہ مایوسی کی ماری ہوئی عورتوں کی باتوں میں آ گئی اور گامے شاہ کے گھر جا پہنچی....

"مجھے یہ بات اس طرح معلوم ہوئی کہ منظور میرے گھر آیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ آمنہ گامے شاہ کے گھر گئی تھی اور گامے شاہ نے اُس کی عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے اور آمنہ اُسے گالی گلوچ کر کے واپس آ گئی اور منظور کو بتایا۔ اگر وہ چال چلن کی ایسی ویسی ہوتی تو گامے شاہ سے اولاد لے لیتی اور اُس کا خاوند اسے اپنی اولاد سمجھتا رہتا۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"چار پانچ دن گزر گئے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "ہاں.... اصل تماشہ تو اس سے آگے ہُوا تھا۔ منظور نے تو آمنہ کو اتنا ہی کہا تھا کہ آئندہ وہاں نہ جایا کرو لیکن ہُوا یہ کہ جب آمنہ نے منظور کو یہ بات بتائی تھی اُس

وقت قیوم بھی ان کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ قیوم بھڑک اُٹھا۔ اُس نے منظور سے کہا کہ چلو اُٹھو، اس بدمعاش کی ابھی خبر لیتے ہیں۔ منظور کو قیوم کا ساتھ مل گیا تو وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہ دونوں بھی جانتے تھے کہ گامے شاہ اصل میں کیا ہے۔ دونوں گامے شاہ کے گھر جا دھمکے اور اُسے باہر بلا کر اتنا مارا کہ وہ بہت دیر تک تو اُٹھ ہی نہ سکا۔ اُس کے ساتھ دو تین شرابی جواری رہتے ہیں۔ وہ گامے شاہ کو بچانے کے لئے آگے آتے تو ان دونوں نے اُنہیں بھی ٹکا دیں۔"

مقتول کے اس دوست نے یہ واقعہ مجھے میری دلچسپی کی خاطر سُنایا تھا۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ ایسی باتیں میرے لئے کتنی ضروری ہیں۔ میں گامے شاہ کو جانتا تھا بلکہ اتنا زیادہ جانتا تھا جتنا کوئی اور نہیں جان سکتا تھا۔ اُس نے اچھا خاصا فراڈ چلایا ہُوا تھا۔ وہ پولیس کے ریکارڈ پر بھی تھا۔ دس بارہ سال پہلے اُسے ڈکیتی کے جرم میں چار سال سزا ہوئی تھی۔ دلیر قسم کا جرائم پیشہ تھا اور اُس کے ساتھ علاقے کے دو تین بدمعاش بھی تھے اور دو تین عادی مجرم بھی۔ مجھ سے پہلا تھانیدار اُس سے باقاعدہ ماہوار کمیشن لیتا رہا تھا۔ میں نے آکر اس اڈے کے دروازے بند کر دیے تھے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اس اڈے کی ساری بدمعاشی ختم کر دی تھی۔

یہ واقعہ سُن کر میرا ذہن فوراً گامے شاہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ گامے شاہ میں انتقام لینے کی ہمت ہے۔ میں نے یہ واقعہ مزید کُریدا اور منظور کے اس دوست نے، جو کچھ وہ جانتا تھا مجھے بتایا۔

چیخیں آمنہ کی تھیں

"اگر میں یہ کہوں کہ منظور کا قاتل قیوم ہے تو تم کیا کہو گے؟" — میں نے منظور کے دوست سے پوچھا۔

"میں نہیں مانوں گا" — اُس نے جواب دیا — "اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو مجھے دو آدمیوں پر شک ہے۔ ایک تو یہ گامے شاہ ہے اور یہ دوسرا رشید۔"

"لیکن مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی" — میں نے یہ بات اس طرح کی جیسے میں ناتجربہ کار اور اناڑی ہوں — "قتل رشید کو ہونا چاہیئے تھا کیونکہ منظور اُس سے تنگ آیا ہُوا تھا اور اُس نے منظور کا حق دبایا ہُوا تھا.... اگر تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ ان دونوں کی آپس میں کہیں لڑائی ہوئی تھی اور رشید نے اس طرح انتقام لیا ہے یا منظور نے رشید کو دھمکی دی ہو کہ وہ اپنا حصہ وصول کرنے کی کوئی خطرناک کوشش کرے گا تو سمجھ میں آ سکتا ہے کہ رشید نے منظور کو راستے سے ہٹا دیا۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہُوا" — اُس نے کہا — "اگر اندر اندر کوئی بات ہوئی ہو تو وہ میں نہیں بتا سکتا۔ منظور نے مجھ سے کبھی کوئی بات چھپائی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ پچھلے دنوں منظور نے دو تین مرتبہ یہ الفاظ کہے تھے کہ رشید کو میں سبق سکھاؤں گا۔ میں نے بہت برداشت کیا ہے لیکن وہ بالکل ہی میرے سر چڑھ گیا ہے....

"میں نے منظور سے پوچھا تھا کہ کیا کرو گے۔ اُس نے کہا تھا کہ میرا دماغ بگڑ گیا تو میں اسے دنیا سے ہی اُٹھا دوں گا.... میں نے پوچھا تھا قتل کرو گے؟ اُس نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ قتل کرنا کون سا مشکل ہے، میں بدلہ لینے پہ آ گیا تو قتل سے نیچے کچھ بھی نہیں سوچوں گا۔"

"کیا منظور اتنی جرأت کر سکتا تھا؟"

"وہ اس سے زیادہ جرأت والا تھا جناب!" — اُس نے کہا —

"میں آپ کے پاؤں کی خاک ہوں۔ کم عقل آدمی ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ جرأت اور دلیری یہ نہیں ہوتی کہ آدمی ہر کسی کے گلے پڑتا رہے اور معمولی سی بات

پر لاٹھی کلہاڑی لے کر نکل آتے۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ برداشت اور درگزر کرنے والا آدمی زیادہ جرأت اور ہمّت والا ہوتا ہے۔"

میں اب اس سوچ میں پڑ گیا کہ شاید ایسا ہُوا ہو کہ منظور اور رشید کا کہیں آمنا سامنا ہو گیا ہو، ان کا لڑائی جھگڑا ہُوا ہو اور رشید نے اسے مار ڈالا ہو۔ یہ واردات ایسی تھی جس کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ واردات رات کو ہوئی۔ میں نے اب رشید کو اپنے چکر میں لینا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گامے شاہ کو بھی میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گاؤں کے چوکیدار کو بُلا کر اُسے تین نام بتائے اور کہا کہ انہیں ساتھ لے آؤ۔ یہ تینوں گامے شاہ کے خاص آدمی تھے۔ میں گامے شاہ سے پہلے ان سے پُوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مقتول کے اس دوست کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ اس کا میں نے شکریہ بھی بہت ادا کیا تھا کہ اُس نے بڑے کام کی باتیں بتائی تھیں۔ جاتے جاتے میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ جاسوسی کرتا رہے۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے مقتول کے ایک اور دوست کو بُلایا۔ اُس سے پُوچھ گچھ کی۔ وہ اتنی زیادہ باتیں نہیں جانتا تھا جتنی پہلا دوست بتا گیا تھا۔ اُس نے کوئی نئی چیز تو نہیں بتائی البتہ جو کچھ بھی اُس نے بتایا وہ اس بیان کی تائید کرتا تھا جو اِن کا پہلا دوست مجھے دے گیا تھا۔ مقتول کے تیسرے دوست کو بلایا۔ اُس نے بھی اپنے دونوں دوستوں کے بیان کی تائید کی۔

مَیں نے ان تینوں سے یہ سوال پوچھا تھا کہ قیوّم کے تعلقات آمنہ کے ساتھ کیسے ہیں۔ تینوں نے کہا کہ ان کے تعلقات بالکل صاف تھے۔ تیسرے دوست نے صاف لفظوں میں کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیوّم آمنہ کی خاطر اُس کے گھر جاتا تھا لیکن ان کے تعلقات میں خرابی والی کوئی بات نہیں تھی۔

سورج غروب ہونے والا تھا جب پوسٹ مارٹم رپورٹ آئی۔ اس میں موت کا وقت اندازاً لکھا گیا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے کے گھنٹہ یا ڈیڑھ

گھنٹہ بعد کا وقت بنتا تھا۔ سرجن نے گردن اور سر پر وہی دو زخم لکھے تھے جو میں نے دیکھے تھے اور اُس کی رائے یہ تھی کہ یہی زخم موت کا باعث بنے ہیں۔ میں نے اس سے یہ اخذ کیا کہ زخم پیچھے کی طرف ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتول پر پیچھے سے حملہ کیا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا یعنی یہ میرا تجربہ تھا کہ قاتل اور مقتول کی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اگر لڑائی ہوتی تو قاتل جس کے پاس کلہاڑی تھی سامنے سے وار کرتا اور زخم مُنہ پر، سر کے اُوپر یا کندھوں پر ہوتے۔ ایسے قتل اس طرح ہوتے تھے کہ قاتل گھات میں بیٹھے ہوتے تھے۔

میرے لئے یہ معلوم کرنا اتنا ضروری نہیں تھا کہ قاتل نے کس طرف سے اور کس طرح وار کئے۔ مجھے تو قاتل مطلوب تھا۔ ابھی تو میں قتل کا باعث معلوم کرنے کی کوشش میں تھا۔ مجھے رات وہیں گزارنی تھی۔ مقتول کا گھر چوپال سے زیادہ دُور نہیں تھا اور چوپال ساؤنڈ پروف نہیں تھا۔ لاش آ گئی تھی اور تمام رات عورتوں کے رونے کی، بین کرنے کی اور چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ مجھے صبح پوچھنے پر پتہ چلا تھا کہ یہ چیخیں آمنہ کی تھیں۔ پولیس والوں کو پتھر دل ہونا پڑتا ہے۔ ایسے ایسے جذباتی اور ماتمی منظر سامنے آتے ہیں جو پتھروں کے بھی آنسو نکال دیتے ہیں۔ میں اتنے زیادہ آدمیوں سے تفتیش کر چکا تھا۔ کسی ایک نے بھی منظور کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ سب نے تعریف ہی کی تھی۔ میں رات بھر مختلف افراد کے بیان بھی لیتا رہا اور عورتوں کی آہ و زاری بھی سُنتا اور برداشت کرتا رہا۔

مَیں نے قیوّم کو بلا بھیجا۔ پہلے مجھے یہ بتایا گیا کہ وہ نہیں آ رہا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ اُسے ساتھ لے آؤ۔ اگر اب اُس نے آنے سے انکار کیا تو میں اُسے ہتھکڑی لگا کر یہاں لے آؤں گا۔ کچھ دیر بعد ایک خوبرو جوان میرے سامنے لایا گیا۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ ہے قیوّم۔

خدا، آمنہ کی آنکھوں میں

"آجوان!" ــــ میں نے قیوم سے دوستانہ سے لہجے میں کہا ــــ "ہمیں تمہاری ضرورت پڑی تو تم نے آنے سے ہی انکار کر دیا۔ ہم تمہارے مہمان ہیں۔"

"سر آنکھوں پہ سرکار!" ــــ اُس نے میرے ساتھ دونوں ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا ــــ "آپ تو یہیں ہیں، اُدھر میرا یار دُنیا سے جا رہا ہے" ــــ اتنا کہہ کر وہ چُپ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کر کہنے لگا ــــ "آپ کا پیغام ملا تھا کہ میں نے اب بھی آنے سے انکار کیا تو آپ مجھے ہتھکڑی لگا کر یہاں لے آئیں گے۔ میں ہتھکڑی کے ڈر سے نہیں آیا۔ میں اس لئے آگیا ہوں کہ آپ یہ نہ کہیں کہ قیوم کتنا گھٹیا آدمی ہے۔"

"بیٹھو تو سہی یار!" ــــ میں نے پیار اور محبت کے لہجے میں کہا ــــ "چلے جانا۔ کفن دفن تو صبح ہوگا۔"

"مجھے یہاں بٹھانے کا ایک ہی طریقہ ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ کے پاس پستول ہے۔ مجھے گولی ماریں۔ پھر میں یہیں رہوں گا۔ جب تک میرے یار کی میت گھر میں رکھی ہے میں خدا کے سوا کسی اور کا حکم نہیں مانوں گا۔ میں نے بہت سے انتظام کرنے ہیں۔ آمنہ بھابی اکیلی ہے اور اُسے کوئی ہوش نہیں ..... میں یہیں ہوں جناب! آپ کا حکم ٹال نہیں رہا۔ جنازہ ہوتے ہی سرکار کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اجازت دیں گے تو یہاں سے ہلوں گا۔ اگر آپ زبردستی بٹھائیں گے تو میں نہیں بیٹھوں گا۔"

میں نے نمبردار کو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ باہر چلا جائے اور وہ باہر چلا گیا تھا۔

"میں تمہیں نہیں روکوں گا قیوم!" ــــ میں نے کہا ــــ "میری مجبوری

یہ ہے کہ میں نے تفتیش پوری کرنی ہے اور صبح سے پہلے پہلے قاتل کو پکڑنا ہے۔ انتظام کرنے والے موجود ہیں۔ منظور کا چچا ہے۔ اُس کے بیٹے ہیں اور اُس کے سسرال والے ہیں۔"

"چچا اور اُس کے بیٹے!" ــــ قیوم نے طنزیہ سے لہجے میں کہا ــــ "قاتل مقتول کے گھر کا انتظام نہیں چلایا کرتے۔"

"کون ہے قاتل؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"یہی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "منظور کے چاچے کے بیٹے۔"

"تینوں؟"

"مجھے صرف ایک پر شک ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "اُس کا نام رشید ہے ..... لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ نے اُس کا جُرم ثابت نہ کیا یا آپ سے نہ ہو سکا تو میں اُسے پکڑوں گا۔ میں خود ہی جُرم ثابت کر دوں گا اور خود ہی اُسے سزا دوں گا۔"

"نہیں قیوم!" ــــ میں نے کہا ــــ "وہ ثبوت مجھے دے دو۔ میں ہی اُسے پکڑوں تو زیادہ اچھا ہے۔ تم نے بدلہ لیا تو سزا پا جاؤ گے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تم جیسا خوبصورت جوان اور اتنا دلیر اور عقلمند میرے ہوتے ہوئے پھانسی کے تختے پر کھڑا ہو جائے یا کالا پانی پہنچا دیا جائے۔ تم جیسے جوانوں کی قدر کوئی مجھ سے پوچھے۔ تمہارے دماغ تک کون پہنچ سکتا ہے ..... سارا گاؤں گواہی دیتا ہے کہ قیوم شیر کا بچہ ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھے رہو اور میں تمہاری باتیں سُنوں۔ صرف اتنا بتا دو کہ رشید کو تم نے قاتل کیوں کہا ہے۔ میں رشید کو بلاؤں گا تو ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ بولے گا اور انکار کرے گا لیکن میں تمہیں سچا سمجھتا ہوں۔ تم جو کچھ بھی کہو گے میں اُسی کو سچ مانوں گا۔"

ظاہری طور پر اور باتوں سے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس شخص کا دماغی توازن کچھ بگڑا ہُوا ہے۔ چونکہ مجھے پہلے بتا دیا گیا تھا اس لئے میں اُسے بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی حد تک ابنارمل تھا۔ ایک طرف یہ کہتا

کہ میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہا کہ آپ اجازت دیں گے تو یہاں سے ہلوں گا۔ ایک طرف اتنا جذباتی کہ جب تک اُس کے یار کی میت گھر میں پڑی ہے وہ یہاں نہیں بیٹھے گا۔ دوسری طرف اُس کی یہ حالت کہ میں نے اُسے پھونک دی تو وہ اپنے آپ ہی بیٹھ گیا۔ میں اُس کی کمزوری سمجھ گیا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ اُس نے رشید کو قاتل کیوں کہا ہے، اُس نے وہی کہانی سُنا دی جو مقتول کا دوست مجھے سُنا چکا تھا۔ ان دونوں بیانات میں الفاظ کا کچھ فرق تھا، واقعات اور موٹی موٹی باتیں ایک جیسی تھیں۔

"ایک بات بتاؤ قیوم!" — میں نے کہا — "منظور نے کبھی یہ کہا تھا کہ وہ رشید کو قتل کر دے گا؟"

قیوم نے فوراً جواب نہ دیا۔ پہلے دائیں بائیں دیکھا پھر چھت کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھا اور اس طرح سر ہلایا جیسے اُسے معلوم نہیں۔

"شاید کبھی کہا ہو" — اُس نے ایسی آواز میں کہا جو کچھ بے جان سی تھی۔ پھر کہنے لگا — "منظور اُس سے بہت تنگ تھا.... سرکار! اس رشید سے کو تو میں ہی پار کرنے لگا تھا لیکن آمنہ بھابی نے مجھے روک دیا تھا۔"

"کوئی خاص بات ہوتی تھی یا پُرانی باتوں پر تم اُسے ختم کرنے لگے تھے؟"

"بڑی خاص بات تھی سرکار!" — اُس نے جواب دیا — "ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ رشید منظور کے گھر کسی کام سے گیا۔ آمنہ بھابی اکیلی تھی۔ اس ذلیل آدمی نے آمنہ کو پھسلانے کی کوشش شروع کر دی۔ آمنہ بھابی نے اُسے بُرا بھلا کہہ کر گھر سے باہر کیا۔ دو تین روز بعد آمنہ بھابی کھیتوں میں گئی تو رشید نے اُسے وہاں روک لیا اور کہا کہ معلوم نہیں تم منظور جیسے کمزور اور بُزدل آدمی کے ساتھ کس طرح وقت گزار رہی ہو۔ آمنہ بھابی نے اُسے کہا کہ شاید تم زندہ نہیں رہنا چاہتے۔ تم تو دُنیا میں نہیں رہو گے تمہارے پچھلے مان جائیں گے کہ منظور کمزور بھی نہیں اور بزدل بھی نہیں اور وہ تمہاری

طرح چھچھورا بھی نہیں.... رشید نے آمنہ بھابی کے ساتھ کچھ اور بکواس بھی کی تھی....

"مجھے منظور نے بہت دنوں بعد یہ بات بتائی تھی۔ آمنہ بھابی نے اُسی روز منظور کو بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ پہلے بھی ایسی بے ہودہ حرکت ہمارے گھر میں آکر کر چکا ہے لیکن میں نے اس لئے یہ بات اپنے دل میں رکھی کہ خون خرابہ ہو جاتے گا....

"میں نے یہ بات منظور سے بہت دنوں بعد سُنی تو میں نے اُسے کہا کہ اُس نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ منظور نے کہا کہ مَیں نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر لیا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیا کیا ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ رشید سے ملا تھا اور اُسے کہا تھا کہ پھر کبھی اُس نے ایسی حرکت کی تو اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ منظور نے یہ بھی بتایا تھا کہ رشید نے اُلٹا منظور کو دھمکایا تھا۔ منظور نے اُس کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دبا لی تھی۔ دباتی بھی ایسی کہ رشید کی آنکھیں باہر آگئیں۔ منظور نے اُسے چھوڑ دیا اور کہا کہ جا، مَیں تیری زندگی تجھے واپس کرتا ہوں۔ رشید نے وہاں سے کھسکنے کی کی۔ منظور نے مجھے بتایا کہ تھوڑی دُور جا کر اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور کہا منظورے! اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔"

"اس کے بعد رشید نے کوئی حرکت نہیں کی؟" — میں نے پوچھا۔

"اگر کرتا تو آج نہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوتا نہ رشید اس دُنیا میں ہوتا" — قیوم نے جواب دیا — "جس روز منظور نے مجھے یہ بات سنائی تھی اُس سے دو تین روز بعد میں اپنے کھیتوں کو دیکھنے گیا تو رشید راستے میں مل گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور کہا کہ وہ منظور تھا جس نے تمہیں چھوڑ دیا تھا۔ مَیں نے اُس کا کندھا بڑی زور زور سے ہلایا اور کہا کہ گاؤں میں میرے سامنے سر اونچا کر کے نہ چلنا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ منظور کو کبھی بزدل نہ سمجھنا۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اُسی کے ہاتھوں مرو گے۔"

"اُس نے کوئی جواب دیا ہوگا!"

"یقین کرنا تھانیدار صاحب!" — قیوم نے کہا — "وہ مجھے جانتا تھا۔ اُس کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلی۔ اُس کے چہرے پر لکھا ہُوا تھا کہ وہ معافی مانگنا چاہتا ہے لیکن معافی مانگنے میں وہ اپنی بے عزتی سمجھتا ہے۔ میں نے اُس پر رحم کیا اور چھوڑ دیا .... دراصل سرکار! ہمیں آمنہ کچھ نہیں کرنے دیتی تھی۔ آمنہ اور منظور کی آپس میں اتنی زیادہ محبت تھی کہ دونوں ایک دوسرے کی کوئی بات ٹالتے نہیں تھے۔"

"آمنہ تو تمہارے ساتھ بھی بہت محبت کرتی تھی" — میں نے کہا۔

"کیا بہن کے دل میں بھائی کی محبت نہیں ہوتی؟" — اُس نے کہا — "فرق یہی ہے کہ ہمارے ماں باپ مختلف تھے لیکن مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اور آمنہ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"قیوم!" — میں نے کہا — "میں تمہاری محبت کو مان گیا ہوں لیکن ایک بات سوچنے والی ہے۔ لوگ تو کوئی اور ہی شک کرتے ہوں گے۔"

"کرتے ہیں جی!" — اُس نے بڑی پختگی سے جواب دیا — "لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ قیوم پاگل ہے۔ لوگوں کا کیا ہے! خدا ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"کسی نے بتایا تھا کہ تمہیں کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ بھی نہیں دیتا" — میں نے کہا اور اُس کا دل خوش کرنے کے لئے میں نے یہ بھی کہہ دیا — "میں نے جب یہ بات سُنی تو مجھے بہت غصّہ آیا کیونکہ اسی گاؤں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ قیوم جیسا کوئی نیک جوان مرد ہے ہی نہیں۔"

"کوئی رشتہ دے گا بھی تو میں قبول نہیں کروں گا" — اُس نے کہا — "جب تک آمنہ میرے سامنے موجود ہے میں کسی اور عورت کا ساتھ قبول نہیں کروں گا۔"

میں نے اُسے یہ نہ جتایا کہ وہ جو بات کہہ بیٹھا ہے اس کا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اُس کے مُنہ سے اصل بات نکل گئی ہے۔ آمنہ کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کو قبول نہ کرنا یہی ظاہر کرتا ہے

کہ ان کا تعلق دوسری قسم کا بھی تھا۔ اُس کا آمنہ کو بہن کہنا پردہ پوشی ہو سکتی تھی۔

میں خاص طور پر دیکھ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کرے گا جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ اُس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ اُس نے ایسی کوئی بات نہ کی۔

"قیوم بھائی!" — میں نے کہا — "تم اپنے دماغ میں کبھی کبھی کوئی گڑبڑ محسوس کیا کرتے ہو؟"

"ہاں" — اُس نے جواب دیا — "کبھی کبھی اپنے آپ میں گُم ہو جاتا ہوں۔ پھر اس طرح محسوس کرتا ہوں کہ میں رستہ بھُول گیا ہوں .... تھانیدار صاحب! آپ نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟"

"نہیں قیوم!" — میں نے کہا — "خدا تو کسی کو بھی نظر نہیں آتا۔"

"مَیں نے دیکھا ہے" — اُس نے کہا۔

"کبھی مجھے بھی دکھا دو یار!" — میں نے کہا — "تم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"لیکن وہاں آپ کو نظر نہیں آئے گا" — اُس نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا — "مَیں نے تو خدا کو آمنہ کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔"

اب اُس نے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کا ذہنی توازن صحیح نہیں۔ اُس سے بہت باتیں کیں بلکہ میں نے اُس سے باتیں کروائیں۔ مجھے اُمید تھی کہ اُس کا ذہن بگڑتا جاتے گا اور اُس کے مُنہ سے راز کی بات نکل جاتے گی لیکن میری امید پوری نہ ہوئی۔ اگر ایسی ہی باتوں پر لوگ اُسے پاگل کہتے تھے تو وہ پاگل نہیں تھا۔ دیہات میں آج بھی لوگ ایسی باتیں سُننا گوارا نہیں کرتے۔ شہروں کے اکثر تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسی باتوں کو کفر کہتے ہیں۔ اُس وقت تو دیہات میں تعلیم کا نام و نشان نہیں تھا۔ اُس کا یہ کہنا کہ اُسے آمنہ کی آنکھوں میں خدا نظر آتا ہے، کون برداشت کر سکتا ہے۔

اُس کا سب سے بڑا "پاگل پن" تو یہ تھا کہ وہ پیروں کو اور مزاروں کی کرامات کو نہیں مانتا تھا اور اُن کے خلاف باتیں کرتا تھا۔ اُس کا اپنا خاندان اس علاقے کے سب سے بڑے پیر کا مرید تھا لیکن قیوم اُسے بھی پیر نہیں مانتا تھا۔ قیوم چونکہ صرف پانچ جماعتیں پڑھا ہُوا تھا اس لئے وہ کتابوں جیسی دلیلیں نہیں دے سکتا تھا۔ جس بات کو وہ غلط سمجھتا تھا اسے وہ اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا تھا اس لئے اُسے غصّہ آجاتا تھا۔ اُس نے مجھے ایسی بات بتائی تو نہیں، یہ خیال مجھے خود آیا کہ اُسے پاگل قرار دینے میں پیروں کا زیادہ عمل دخل تھا۔

پھر بھی میں نے یہ رائے قائم کی کہ اس کا ذہن ہلا ہُوا ہے، البتہ پاگل نہیں تھا۔ ایسے انسان انتہا پسند ہُوا کرتے ہیں۔ گرم ہو جائیں تو شعلہ بن جاتے ہیں، سرد ہو جائیں تو برف کا بلاک بن جاتے ہیں۔ جہاں تک قیوم کا تعلق ہے وہ بھی انتہا پسند تھا اور اُس پر وہ کہاوت یا لطیفہ صادق آتا ہے کہ میں پاگل ہوں بیوقوف نہیں ہوں — اُس کی خرابی ذہنی تھی دماغی نہیں تھی۔ پاگل تو عقل سے عاری ہوتا ہے۔ نہ کچھ سمجھتا ہے نہ کچھ سمجھا سکتا ہے۔

وہ جو کچھ بھی تھا، میری دلچسپی تو اُس شخص کے ساتھ تھی جس نے منظور کو قتل کیا تھا۔ میرا شک قیوم پر تھا جو اَب کمزور پڑ گیا تھا۔ قیوم کے دل اور آنکھوں میں آمنہ کی جو حیثیت تھی وہ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ ایک خاص قسم کی محبت ہوتی ہے۔ یہ سب سمجھنے کے باوجود میں نے قیوم کو ذہن سے اُتارا نہیں۔ ایسے ذہن کے آدمی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ وہ کوئی بھی خلافِ توقع حرکت کر سکتا ہے۔

مقتول کے گھر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آمنہ کی چیخ نما آواز سنائی دیتی تھی۔ اس آواز پر ہر بار قیوم چونک اُٹھتا تھا۔ بولتے بولتے چُپ ہو جاتا تھا۔ ہمارے درمیان بہت باتیں ہو چکی تھیں۔ میں نے اسے شاملِ تفتیش رکھنا تھا۔ میں کچھ کہہ رہا تھا کہ آمنہ کی ایک چیخ سنائی دی۔ قیوم اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"آمنہ بھابی رو رہی ہے" — اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے ابھی رو پڑے گا — "سرکار مجھے جس وقت بلائیں گے آجاؤں گا۔ جب تک تھانے میں یا جہاں کہیں بھی اپنے ساتھ رکھیں گے رہوں گا۔ اب جانے دیں۔"

"جاؤ قیوم!" — میں نے اُسے اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے پیار سے کہا — "میں تمہیں پھر بُلا لوں گا۔ تمہاری مدد کی تو مجھے بہت ضرورت ہے۔"

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا دایاں ہاتھ پکڑ لیا اور میرا ہاتھ چُوم کر چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اِس خوبرو جوان کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن اور ماں کے صدمے کا مارا ہُوا تھا۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

وہ باہر نکلا تو قیوم کا باپ نمبردار کو ساتھ لئے اندر آیا۔ نمبردار نے مجھے بتایا کہ یہ قیوم کا باپ ہے اور مجھے ملنا چاہتا ہے۔ وہ بڑے درجے کا زمیندار تھا۔ شکل وصورت، لباس اور انداز سے معزز اور رُعب داب والا لگتا تھا۔ میں نے اُسے بٹھایا۔

"میرے بیٹے پر کوئی شک وشبہ ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا" — میں نے کہا — "آپ مجھے یہ کہنے آئے ہیں کہ آپ کے بیٹے کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"ایسے ہر بیٹے کا باپ یہی کہے گا حضور!" — اُس نے کہا — "میں بھی باپ ہوں اور اس بیٹے کے ساتھ مجھے بہت پیار ہے" — اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا — "اپنی چھوٹی بہن اور ماں کی موت نے اس کے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا ہے .... پھر یہ بددعایا گیا۔ اپنے پیر صاحب کے خلاف جو مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔ مزاروں اور خانقاہوں کی بےحرمتی کرتا ہے۔

اسے بددعا تو لگنی ہی تھی۔ اگر یہ صرف ایک تعویذ گلے میں ڈال لے یا بازو سے باندھ لے تو یہ صحیح ہو جاتے لیکن یہ تعویذوں کو مانتا ہی نہیں۔"

"میں آپ سے اور کچھ نہیں پوچھتا" —— میں نے کہا —— "مجھے یہ بتائیں کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟"

"اگر منظور زندہ ہوتا تو وہ آپ کو بتاتا کہ قیوم کا اُس کی بیوی کے ساتھ کیا تعلق ہے" —— اُس نے کہا —— "منظور ایسا بے غیرت تو نہیں تھا کہ وہ ایک غیر مرد کو گھر میں آنے سے نہ روکتا۔ میں نے خود منظور سے کہا تھا کہ تمہاری بیوی جوان ہے اور میرا بیٹا بھی جوان ہے۔ اگر ذرا سا بھی شک ہو تو میرے بیٹے کو گھر سے نکال دینا اور مجھے بتا دینا۔ منظور نے کہا تھا کہ مجھے قیوم اور اپنی بیوی پر پورا اعتماد ہے۔"

وہ باپ تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ رسمی سی باتیں کیں اور پوچھا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ اُس نے رشید پر شک کا اظہار کیا اور دشمنی کی وجہ زمین کی تقسیم بتائی۔ اُس سے میں نے کچھ اور باتیں پوچھیں لیکن اُس کا دھیان اپنے بیٹے پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دلاسہ دے کر رخصت کر دیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ مجھے اپنے سامنے ایک پیچیدہ تفتیش نظر آ رہی تھی۔ میں تھوڑا سا آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ گامے شاہ کے تینوں ساتھی آ گئے تھے۔ اس قماش کے آدمیوں سے شریفانہ طریقے سے پوچھ گچھ نہیں کی جاتی تھی۔ انہیں میں نے تھانے بھیج دیا۔ ان سے تفتیش کی وہی جگہ موزوں تھی۔ انہیں تھانے میں میرا انتظار کرنا تھا خواہ دس دن گزر جاتے۔

میری آنکھ کھلی تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ پُرتکلف اور مرغن ناشتے کے بعد رشید کو بلایا۔ وہ بھی اچھی شکل وصورت اور بڑے اچھے جسم اور قد کا جوان تھا۔

اُس کے متعلق مجھے کوئی اچھی بات نہیں بتائی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُس کا اتنا اچھا چہرہ مجھے اچھا نہ لگا۔ اس سے تو مجھے قیوم کا چہرہ اچھا لگا تھا۔ میں نے رشید کو اپنے سامنے بٹھایا تو اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور اُس کی آنکھیں جیسے باہر کو آ رہی تھیں۔

"تم ہی کچھ بتاؤ رشید!" —— میں نے کہا —— "مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ منظور کو کس نے قتل کیا ہے؟"

اُس نے فوراً جواب نہ دیا۔ گھونٹ سا نگل کر اُس نے بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں جناب!" —— اُس نے ذرا مشکل سے ہی یہ الفاظ کہے۔

"اتنا نہ گھبراؤ رشید!" —— میں نے کہا —— "یہی معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ کھل کر بات کرو۔ مجھے جو دوسروں سے پتہ چلے گا وہ اپنی زبان سے بتا دو پھر دیکھو میں تمہیں کتنا فائدہ پہنچاتا ہوں۔"

"میں تو کچھ نہیں جانتا جناب!" —— اُس نے کہا اور آنکھیں جھکا لیں۔

"اوپر دیکھو" —— میں نے کہا —— "تم سب کچھ جانتے ہو۔ تم نے آخر بولنا ہے اور جو کچھ بھی تم جانتے ہو وہ میرے سامنے اُگل دو گے .... تم نے کس بات کا انتقام لیا ہے .... منظور اپنا وہ حصہ لینے کی کوشش کر رہا تھا جو تم نے دبا لیا تھا۔ تم نے سوچا کہ اسے زمین کے تختے سے ہی اُٹھا دو۔"

"نہیں جناب!" —— یکلخت اُس میں جان آ گئی اور وہ تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے لگا۔

مجھے اُن کی دشمنی کی جتنی وجوہات بتائی گئی تھیں وہ سب باری باری اُس کے سامنے رکھیں۔ وہ انکار کرتا رہا۔ اُس نے انکار ہی کرنا تھا۔ میں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ قتل کے وقت وہ کہاں تھا۔ اُس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ گھر میں تھا۔

"سورج غروب ہونے کے کتنی دیر بعد تم گھر آئے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں تو سورج غروب ہوتے ہی گھر آگیا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کہاں تھے؟"

"اپنے باغ میں" — اُس نے جواب دیا۔

چونکہ یہ میرا پکا مُشتبہ تھا اس لئے میں نے اس سے مخصوص انداز سے پوچھ گچھ کی۔ یہ الفاظ اور زبان کے کرتب ہوتے ہیں۔ بعض آدمی تو اتنے کمزور ذہن اور دل کے ہوتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتے ہیں، زبان پر قابو نہیں رہتا اور وہ پہلے پوچھے ہوتے سوالوں کے جواب پہلے سے مختلف دینے لگتے ہیں۔ بعض کی حالت اتنی بُری ہو جاتی ہے کہ وہ سچی بات کہہ ڈالتے ہیں۔

رشید کو میں نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اُس کی کچھ باتوں کو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اُسے وہیں بیٹھے رہنے دیا۔ میں باہر نکلا اور چوکیدار سے کہا کہ رشید کے باغ میں جو مزارعہ کام کرتا ہے، اُسے اور اُس کی بیوی کو بُلا لائے۔ یہ مزارعہ بیوی اور دو تین بچوں کے ساتھ باغ میں ہی رہتا تھا۔

رشید کو میں نے باہر بٹھا دیا اور اُس کے باپ کو بلایا۔ اُس سے پوچھا کہ رشید قتل والی رات شام کو کس وقت گھر آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ سورج غروب ہونے کے بہت بعد آیا تھا۔

"ایک گھنٹہ؟" — میں نے پوچھا — "دو گھنٹے؟"

"ڈیڑھ دو گھنٹے سمجھ لیں" — اُس نے جواب دیا۔

یہ شخص رشید کا باپ تھا۔ اُسے یقیناً معلوم ہو گا کہ اُس کا بیٹا مُشتبہ ہے اس لئے میں توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ یہ کوئی صحیح بات بتائے گا۔

میں تمہاری بیوی نہیں بن سکتی

رشید کے باپ کا مزارعہ اپنی بیوی کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا۔

"میری ایک بات غور سے سُن لو" — میں نے اُسے کہا — "تم ان لوگوں کے رشتہ دار نہیں ہو، نوکر ہو۔ ان کی پھانسی کا رسّہ اپنے گلے میں ڈالنے کی بیوقوفی نہ کرنا۔ جو کچھ میں پوچھوں وہ بالکل صحیح بتا دینا... تم جانتے ہو کل رات منظور قتل ہُوا ہے۔ شام کو رشید باغ میں تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں حضور!" — اُس نے جواب دیا — "وہ باغ میں ہی تھا۔"

"کیا وہ اکیلا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"پہلے تو وہ اکیلا ہی تھا" — مزارعہ نے جواب دیا — "پنیری لگانی تھی۔ رشید ہمارے ساتھ رہا۔ شام سے ذرا پہلے منظور آگیا۔"

"کون منظور؟" — میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"یہی منظور جنابِ عالی!" — مزارعہ نے جواب دیا — "یہ جو قتل ہو گیا ہے۔"

مجھے ایسے لگا جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن آئی ہو۔ مقتول کا وہاں کیا کام تھا؟ — اُس کی اور رشید کی تو آپس میں بڑی سخت دشمنی تھی۔

"ہاں، پھر کیا ہُوا؟" — میں نے اس توقع پر پوچھا کہ مزارعہ کہے گا کہ ان کی آپس میں لڑائی یا غصّے میں بول چال ہوئی تھی۔

"منظور رشید کو الگ لے گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "پھر وہ بہت دیر چارپائی پر اکٹھے بیٹھے رہے۔"

"کتنی دیر؟"

"وہ تو جناب، سورج ڈوب گیا، پھر اندھیرا ہو گیا اور وہ بیٹھے رہے" — اُس نے جواب دیا۔

"تم میں سے کسی نے ان کی باتیں نہیں سُنی تھی؟"

"نہیں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ہم دُور کیاروں میں پنیری لگا رہے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو ہم کام چھوڑ کر اپنے کوٹھے میں چلے گئے۔"

"یہ بتاؤ" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا وہ اونچی اونچی باتیں کر رہے تھے؟ ....میرا مطلب یہ ہے کہ وہ باتوں باتوں میں آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے؟"

"نہیں .... نہیں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "وہ تو بڑے آرام آرام سے باتیں کر رہے تھے۔ جب اندھیرا ہو گیا تو منظور اُٹھا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا اور منظور چلا گیا۔"

"اور رشید؟"

"وہ تھوڑی دیر باغ میں رہا" ــــ مزارعہ نے جواب دیا ــــ "اُس نے ہم سے پنیری کے متعلق پوچھا اور کہنے لگا کہ میں جا رہا ہوں، اور وہ چلا گیا۔"

"تم نے اُسے جاتے دیکھا تھا" ــــ میں نے کہا ــــ "اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ تم نے دیکھی تھی؟"

"نہیں حضور!" ــــ مزارعہ نے جواب دیا ــــ "اُس وقت اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی نہیں تھی۔ وہ جانے سے پہلے اپنے کمرے میں گیا تھا جو اُس نے اپنے لئے باغ میں بنوایا ہُوا ہے۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہاں سے وہ نکلا تو اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی یا نہیں۔ اندھیرا ابھی تھا۔"

اس کے بعد میں نے اس مزارعہ کی بیوی کو بُلایا۔ اُس نے بھی یہی کچھ بتایا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ منظور پہلے کبھی باغ میں آیا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ بہت عرصہ پہلے آیا تھا جب ان کے درمیان باغ کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پرسوں دیکھا۔ میں نے اُس سے بھی پوچھا کہ اُس نے اگر رشید کو باغ سے نکلتے دیکھا ہو تو کیا اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی یا نہیں۔

"ہاں جی!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔"

"اندھیرے میں تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی؟"

"پھر ڈنڈہ ہوگا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اُس کے ہاتھ میں ڈنڈہ یا کلہاڑی تھی۔"

میں نے مزارعہ کو پھر اندر بُلا لیا اور ان دونوں سے بہت سے سوال جواب ہوتے، لیکن جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ انہیں میں نے واپس بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد میرے دو مُخبر اکٹھے ہی آگئے۔ ان سے میری پہلے بات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی وہی باتیں بتائیں جو مجھے پہلے معلوم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ آمنہ نیک چلن اور غیرت والی عورت ہے۔ قیوم کے متعلق انہوں نے یہ تو بتایا کہ وہ دماغی طور پر صحیح نہیں، لیکن دونوں نے متفقہ طور پر کہا کہ بات کھری کرتا ہے۔ انہوں نے بھی رشید پر ہی شک کا اظہار کیا۔

"لیکن جناب!" ــــ ایک نے کہا ــــ "گامے شاہ کو بھی آپ سامنے رکھیں۔ قیوم اور منظور نے اُس کو جو کبھی پھینٹی لگائی تھی وہ معمولی نہیں تھی۔ وہ تو کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا تھا پھر اُس نے کہا تھا کہ وہ بدلہ لے گا۔ گامے شاہ کو آپ جانتے ہیں۔ بڑا زہری آدمی ہے۔"

"لیکن اُس نے قیوم سے تو بدلہ نہیں لیا!" ــــ میں نے کہا۔

"وہ کہتا تھا کہ منظور کو ٹھکانے لگا کر اُس کی بیوی کو اغوا کروں گا" ــــ مُخبر نے کہا۔

اس وقت تک مقتول کا کفن دفن ہو چکا تھا اور اُس دن کا سورج بھی ڈوبنے کو تھا۔ میں نے آمنہ کو بلایا۔ وہ آئی تو میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں بہت ہی سُوجی ہوئی تھیں اور اب بھی وہ بیان دینے کی حالت میں نہیں تھی لیکن اُس سے پوچھ گچھ بہت ضروری تھی۔ یہ تو سب نے بتایا تھا کہ آمنہ اچھے چال چلن کی عورت ہے لیکن میں تفتیشی افسر کی نظروں سے ہر کسی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو خاوند کی وفاداری میں ذرا سی بھی کسر نہیں رہنے دیتیں اور اُن کے اخلاق اور چلن کی تعریف ہر کوئی کرتا ہے لیکن

انہوں نے درپردہ اپنی پسند کے کسی ایک آدمی کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہوتی ہے جس کا کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ مجھے ابھی تک آمنہ اور قیوم پر شک تھا۔

"میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا آمنہ!" — میں نے کہا — "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ٹھیک حالت میں نہیں ہو لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میں نے تم سے جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لوں ورنہ تمہیں تھانے میں آنا پڑے گا جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم ذرا اپنے آپ کو سنبھالو اور مجھے کچھ بتاؤ ... منظور اور رشید کی دشمنی کا کیا معاملہ تھا؟ تم نے کچھ باتیں کل بتائی تھیں لیکن وہ بہت مختصر تھیں۔ اب ہر بات مجھے پوری پوری سُنا دو۔"

آمنہ نے وہی کہانی مجھے پھر سُنا دی جو میں پہلے سُن چکا تھا۔

"کیا رشید نے تمہارے ساتھ کبھی چھیڑ خانی کی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"اُس نے دو بار ایسی حرکت کی تھی" — آمنہ نے جواب دیا — "میں نے تنگ آ کر اپنے خاوند کو بتایا۔ قیوم کو بھی پتہ چل گیا۔ یہ دونوں اُس کا وہی حال کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے گامے شاہ کا کیا تھا۔ گامے شاہ نے بھی میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں نے اُسے بہت مارا پیٹا تھا۔ اب یہ رشید کو مارنے پیٹنے پر تیار ہو گئے۔ میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ دُشمنی مول نہ لیں۔ انہوں نے ایک دو روز بعد مجھے بتایا کہ رشید کو انہوں نے پکڑ لیا تھا لیکن اللہ نے میری سُن لی، رشید نے سر جھکا لیا کیونکہ وہ مجرم تھا۔ اس طرح کوئی لڑائی پٹائی نہ ہوئی ... دراصل بات یہ ہے جی! میرا خاوند اکیلا تھا۔ میرے سر کا وہ صاحب تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے، لیکن نقصان پہنچا تو ایسا پہنچا کہ وہ میرے سر سے ہی اُٹھ گیا۔"

"میں نے سُنا ہے کہ وہ رشید کے باغ میں گیا تھا" — میں نے کہا — "وہاں سے نکلا لیکن گھر نہیں پہنچا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ رشید کے باغ میں گیا تھا؟"

"نہیں" — آمنہ نے جواب دیا — "اُس نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ بتاتا بھی کیسے! آپ کہتے ہیں کہ وہاں سے نکلا اور گھر نہ پہنچ سکا۔ اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ اُسے رشید نے قتل کیا ہے۔"

"یہ تو تم کبھی نہیں بتاؤ گی کہ قیوم کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں" — میں نے کہا۔

"میں تو بتا دوں گی" — اُس نے کہا — "لیکن آپ کبھی بھی یقین نہیں کریں گے ... قیوم میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

"آمنہ!" — میں نے کہا — "اگر سچی باتیں کرنی ہیں تو کُھل کر کرو۔ قیوم کے ساتھ تمہارے تعلقات جیسے بھی ہیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں نے منظور کے قاتل کو پکڑنا ہے ... کیا تمہارے دل میں قیوم کی ویسی ہی محبت ہے جیسی اُس کے دل میں ہے؟ میں بات ذرا اور صاف کر دیتا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ خدا کے بعد اگر کسی کی عبادت کرنے کی اجازت ہو تو قیوم تمہارے آگے سجدے کرے۔ کیا تم بھی اُسے اسی طرح چاہتی ہو؟"

"نہیں!" — آمنہ نے جواب دیا — "یہ بارہ تیرہ سال کا تھا جب اس نے میرے قریب آنا شروع کیا۔ اُس وقت تو سمجھتے کہ یہ بچہ تھا۔ اس کی ماں مر گئی تھی۔ ویسے بھی یہ خوبصورت بچہ تھا۔ میں اسے ہمدردی سے اپنے پاس بٹھاتی تھی۔ اس کے بعد میری شادی ہو گئی۔ یہ اُسی طرح میرے پاس آتا رہا۔ یہ اب جوان ہو چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا خاوند اعتراض کرے گا لیکن اُس نے اعتراض نہ کیا بلکہ میں نے ایک بار اپنے خاوند سے کہا کہ قیوم ابھی تک میرے پاس بچوں کی طرح آ رہا ہے۔ آپ تو اعتراض نہیں کرتے لیکن لوگ باتیں بناتے ہوں گے۔ میرے خاوند نے کہا کہ نہ روکو بے چارے کو۔ یہ پیار کا ترسا ہوا معلوم ہوتا ہے ...."

"لوگ کہتے ہیں قیوم پاگل ہے۔ باتیں یہ پاگلوں والی ہی کرتا ہے لیکن جب میرے گھر میں آتا ہے تو کوئی فالتو بات نہیں کرتا۔ کچھ پوچھو تو اس کا جواب

دیتا ہے۔ اُس نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی کہ میں اکیلی ہوں تو میرے پاس آکر بیٹھ جائے۔ اکیلے بھی اس کا سلوک اور رویّہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا میرے خاوند کی موجودگی میں ....

"چار پانچ بار اُس نے مجھے کہا کہ آمنہ، تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہ لگے تو صاف کہہ دینا۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارا آنا مجھے بُرا نہیں لگتا، البتہ لوگوں سے ڈر لگتا ہے، نہ جانے کیا کیا کہتے ہوں گے۔ قیوم نے کہا کہ مجھے پتہ لگ گیا کہ فلاں آدمی نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے تو اُسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا...

"ایک روز یہ میرے گھر آیا۔ میرا خاوند گھر نہیں تھا۔ میں نے قیوم سے کہا کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہی کیوں رہتے ہو؟ کیا میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہوں؟ قیوم نے کہا کہ میں تمہیں صرف دیکھنے ہی آتا ہوں۔ مَیں نے اس سے ذرا ہنس کر کہا کہ جوان آدمی کی جوان عورت کے ساتھ محبت کچھ اور طرح کی ہوتی ہے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ تم میں شاید اتنی جرأت نہیں کہ ایسی بات مُنہ سے کہہ سکو....

"قیوم نے میرے مُنہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے حیران ہو رہا ہو کہ مَیں نے کیا کہہ دیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ یہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا ہے۔ مَیں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ بہت دلاسے دے دے کر میں نے اسے چُپ کرایا۔ تب اس نے کہا، آمنہ! یہ بات کہنے کی بجائے مجھے زہر پلا دیتیں تو وہ مجھے میٹھا لگتا ....بس جی، یہ ہے اس کی محبت۔ لوگوں نے اس پر یہ ظلم کیا کہ کوئی بھی اسے رشتہ دینے کے لئے تیار نہیں ہُوا۔ میں نے اسے صرف ایک بار کہا تھا کہ میں اس کے لئے کسی اور جگہ سے رشتہ لے لوں گی۔ اس نے کہا، نہیں آمنہ! جب تک تم زندہ ہو میں شادی نہیں کروں گا۔"

"تم نے اُس سے پوچھا نہیں تھا کہ اس سے اس کا مطلب کیا تھا؟"

"پوچھا تھا"—— آمنہ نے کہا ——"میں نے تو اُس سے بہت کچھ پوچھا

تھا.... میں نے اسے کہا تھا کہ میں تو تمہاری بیوی نہیں بن سکتی، تمہیں کوئی اور ہی بیوی ملے گی۔ اس نے کہا کہ میں کسی عورت کو اپنی بیوی کے رُوپ میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر میری شادی ہو گئی اور وہ لڑکی مجھے اچھی لگی تو اُسے اپنی بیوی نہیں بنا سکوں گا کیونکہ اُس میں مجھے تم نظر آؤ گی اور تم میرے لئے بڑی پاک چیز ہو۔"

آمنہ فرشتہ نہیں تھی

آمنہ کے ساتھ اُس کے اور قیوم کے متعلق بہت باتیں ہوئیں۔ میں صرف یہ مُشک لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ آمنہ جو کچھ کہہ رہی ہے یہ سچ بھی ہے یا نہیں اور کیا مجھے اس قسم کا سراغ مل سکے گا کہ مقتول کو قیوم نے قتل کیا ہے؟ میں نے آپ کو وہ ساری باتیں نہیں سنائیں جو آمنہ نے کی تھیں۔ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے آپ کو نمونے کے طور پر یہ چند ایک مکالمے سُنائے ہیں۔ اگر میں آپ کو تمام باتیں جو آمنہ نے کی تھیں، سناتا اور جس انداز سے اُس نے باتیں کی تھیں وہ بھی سمجھا سکتا تو آپ کو یہ شک ضرور ہوتا کہ آمنہ کے دل میں قیوم کی بے پناہ محبت تھی۔ میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ وہ قیوم کے معاملے میں بہت ہی جذباتی تھی۔

میں نے فرق معلوم کرنے کے لئے منظور کی باتیں شروع کر دیں۔

آمنہ نے یہ تو اچھی طرح ظاہر کیا کہ اُس کے دل میں منظور کی محبت تھی لیکن منظور کے متعلق وہ اتنی جذباتی نہ ہوتی جتنی قیوم کے لئے ہو گئی تھی۔ آمنہ امیر خاندان کی عورت تو تھی لیکن وہ فرشتہ تو نہیں تھی۔ اَن پڑھ دیہاتن تھی۔ گناہ کرتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ میں نے آمنہ پر جرح کی تو اُس پر میرا شک مزید پختہ ہو گیا۔ میں آپ کو پھر بتاتا ہوں کہ وہ قیوم کے معاملے میں اپنے خاوند کی نسبت زیادہ جذباتی تھی۔ پھر بھی میں نے رشید اور گامے شاہ پر اپنا شک پختہ رکھا۔

"گامے شاہ کے ساتھ کیا ہُوا تھا؟" —— مَیں نے پوچھا۔

اُس نے وہی کہانی دُہرادی جو مَیں پہلے سُن چکا تھا۔ آمنہ نے تھوڑی اور تفصیل بتادی۔ گامے شاہ نے اُسے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے خاوند سے طلاق لے کر میرے ساتھ شادی کرلو۔ اس سے پہلے وہ آمنہ پر ویسے ہی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ جب آمنہ ہاتھ نہ آئی تب اُس نے شادی کی بات کی تھی۔ گامے شاہ نے آمنہ کو صاف لفظوں میں کہا تھا کہ کوئی پیر یا کوئی اور برگزیدہ شخص یا کوئی بہت بڑا جادوگر بے اولاد عورت کو اولاد نہیں دے سکتا۔ صرف اللہ کی ذات ہے جو دینا چاہے تو دے دے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں پیر نے اولاد دی ہے، وہ اولاد اُس پیر کی ہی ہوتی ہے۔ ایک روز گامے شاہ نے آمنہ پر دست درازی کی اور آمنہ نے آکر منظور کو بتادیا اور یہ واقعہ ہُوا جو میں آپ کو سُنا چکا ہُوں۔

مَیں نے آمنہ کو جانے کی اجازت تو دے دی لیکن اُسے ایک مُشتبہ کی حیثیت سے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔ اُس پر میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اُس پر شُبہ ہے۔

رات کو مَیں تھانے میں آگیا۔ جن اشخاص کی مجھے ضرورت تھی اُن سب کو تھانے لے آیا۔ ان میں رشید بھی تھا بلکہ رشید مشتبہوں میں سرفہرست تھا۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ میں نے آرام کرنے کی بجائے رشید کو پلیٹ میں لے لیا۔

"مجھے صرف اس کا جواب دے دو کہ تم نے مجھ سے یہ کیوں چھُپایا تھا کہ منظور قتل ہونے سے پہلے بہت دیر تمہارے پاس بیٹھا رہا تھا" —— میں نے کہا۔

رشید کی ایسی حالت ہوگئی جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں نے

اپنا سوال پھر دُہرایا تو اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ مَیں نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھ کر زور سے جھنجھوڑا۔

"تم جب باغ میں سے منظور کے بعد نکلے تو تمہارے ہاتھ میں کلہاڑی تھی" —— مَیں نے کہا —— "اور تم نے مجھے بتایا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی تم گھر آگئے تھے ..... مجھے ان سوالوں کا تسلی بخش جواب دے دو اور جاؤ۔ میں تمہیں پھر کبھی تھانے نہیں بلاؤں گا۔"

"میں بتا تو دوں گا" —— اُس نے کہا —— "لیکن آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ کو مجھ پر شک ہوگیا ہے۔ آپ کا شک بجا ہے کیونکہ میں نے آپ کے آگے جھوٹ بولا ہے۔ میں اگر قرآن پر ہاتھ رکھ کر بیان دوں گا تو بھی آپ کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"تم بات کرو بھائی میرے!" —— مَیں نے دوستوں کی طرح کہا —— "مَیں نے گاؤں میں ہی تمہیں کہہ دیا تھا کہ ابھی معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم سچ بولو۔"

"نہیں جناب!" —— اُس نے کہا —— "ایسی کوئی بات نہیں۔ منظور کو قتل کرنے سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہونا تھا۔ ہُوا یوں تھا کہ یہ سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے میرے پاس باغ میں آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے ایسا خطرہ نہیں تھا کہ یہ میرے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے آیا ہے اور اس کے پاس پستول ہوگا اور یہ مجھے گولی مار دے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ منظور اس طرح لڑائی جھگڑا کرنے والا آدمی نہیں تھا۔"

"کیا یہ بُزدل یا بے غیرت تھا؟"

"نہیں" —— رشید نے کہا —— "شریف آدمی تھا۔ مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اُس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں ..... پرسوں میرے پاس باغ میں آیا تو میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں حیران ہُوا۔ میں کیاریوں میں پنیری لگوا رہا تھا۔ منظور نے مجھے بازو سے پکڑا اور پرے لے گیا۔ میرا

خیال تھا کہ یہ تقسیم کے جھگڑے کے سلسلے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تیار ہو گیا کہ آج اُس نے کوئی اُلٹی سیدھی بات کی تو میں اس کو بہت بُرا پیٹوں گا، لیکن اُس نے بڑی نرمی سے بات کی۔ کہنے لگا کہ ہم ایک دادا کی اولاد ہیں۔ دوسری برادریاں اور غیر لوگ ہمارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ زیادہ غم تو مجھے ہے کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں تمہارے پاس یہ بات کرنے آیا ہوں کہ جو ہُوا سو ہُوا، اب اگر تم پسند کرو تو ہم سگے بھائیوں کی طرح رہیں گے ....

"مَیں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے اس راستے پر کس نے ڈالا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آمنہ مجھے کبھی بھی نہیں بخشے گی۔ اُس نے کہا کہ آمنہ نے ہی مجھے اس راستے پر ڈالا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ بات تو میں نے خود ہی چھیڑی تھی، جب آمنہ نے سُنی تو وہ کہنے لگی کہ آج ہی شام رشید کے پاس جاؤ... میں نے اُسے کہا کہ تم میرے گھر آجاتے یا مجھے اپنے گھر بلا لیتے، دُشمنی کیا ہے، ہمارا خون ایک ہے .... اُس نے کہا کہ میں نے سوچا یہی تھا لیکن آمنہ نے زور دیا کہ رشید کو باغ میں جا کر ملو جہاں اور کوئی نہیں ہو گا۔ اُس نے کہا کہ آمنہ نے یہ بھی کہا تھا کہ شام کے وقت جانا تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے ورنہ لوگ کہیں گے کہ منظور نے اپنا سَر اپنے دشمنوں کے قدموں میں رکھ دیا ہے ....

"اُس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور جب اُس نے آمنہ کا نام لیا تو میرا دل موم ہو گیا۔ میں نے یہ اُسے ضرور کہا کہ کل پرسوں تم پھر یہ جھگڑا کھڑا کر دو گے کہ یہ باغ تمہارے باپ کا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ سب جھگڑے بھول چکا ہے۔ سچی بات ہے کہ میں اس دشمنی سے خود بھی تنگ آ گیا تھا۔ میں نے اُسے بٹھائے رکھا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا ....

"میں اُس کے جانے کے آدھ یا پون گھنٹے بعد باغ سے نکلا۔ میرے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈہ تھا۔ میں آپ کو وہ ڈنڈہ دکھا سکتا ہوں۔ یہ میں نے

خاص طور پر بنوایا ہُوا ہے۔ میرا راستہ وہی تھا جس راستے پر منظور کی لاش ملی ہے۔ میں اُس جگہ پہنچا تو کوئی آدمی لیٹا ہُوا نظر آیا۔ مجھے خون کی بُو آئی۔ میں نے ماچس جلا کر چہرہ دیکھا تو وہ منظور تھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ میں نے دو تین بار ماچس جلا کر دیکھا۔ میں نے سوچا شاید کوئی اور ہو لیکن وہ منظور تھا...

"دُور جہاں سے گھاٹی اوپر چڑھتی ہے وہاں ایک آدمی مجھے نظر آیا۔ میں اُس آدمی کے پیچھے دوڑا۔ قاتل وہی ہو سکتا تھا۔ وہ دُور تھا۔ میں گھاٹی چڑھا تو وہ آدمی اندھیرے میں چُھپ چکا تھا۔ آگے کھیت اور فصل آ گئے تھے۔ مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ آدمی گاؤں کی طرف آیا تھا۔"

"تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"یہی تو بات ہے حضور جو مجھے پھنسا رہی ہے" — اُس نے کہا — "میرا فرض یہ تھا کہ میں آمنہ کو بتاتا پھر اپنے گھر والوں کو بتاتا اور شور شرابہ کرتا پھر تھانے میں آ کر اطلاع دیتا لیکن مجھے ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ خطرہ یہ تھا کہ سب کو معلوم تھا کہ میری منظور کے ساتھ دشمنی ہے۔ اگر میں بتاتا کہ منظور فلاں جگہ مرا پڑا ہے تو سب یہی کہتے کہ منظور کو میں نے قتل کیا ہے۔ یہ تو میرے مزارعے یا اُس کی بیوی یا اُس کے دو بچوں سے پتہ لگ جاتا کہ قتل ہونے سے پہلے منظور میرے پاس آیا تھا .... اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے جناب! میں نے پوری رات جاگتے اور اندر ہی اندر ڈرتے گزاری ہے۔ جب آپ نے مجھے بلایا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ میں سمجھا کہ آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ منظور قتل ہونے سے پہلے میرے پاس آیا تھا۔"

پھر بھی بے اولاد رہی

"دشمنی کی وجوہات بڑی سخت ہیں رشید!" — میں نے کہا — "انہی باتوں پر [illegible] اور خون خرابے ہوتے ہیں۔"

"ہاں حضور!" — اُس نے کہا — "زمین کی تقسیم کے جھگڑے ...

علاوہ میں نے آمنہ پہ بُری نظر رکھی تھی اور میں نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ منظور کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔ میں اپنی ساری شرارتیں اور بے ہودگیاں جو میں نے منظور سے کی ہیں تسلیم کرتا ہوں۔ قتل تو مجھے ہونا چاہیئے تھا اور قاتل منظور ہوتا۔"

میں اُٹھ کر باہر نکلا اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان کے گاؤں جائے اور آمنہ کو ساتھ لے آئے۔ میں پھر اندر جا کر رشید کا بیان سُننے لگا۔ وہ اب ہر بات بڑی کھُل کر بیان کر رہا تھا۔ میں نے اب یہ دیکھنا تھا کہ آمنہ نے کیا واقعی منظور کو شام کے وقت رشید کے باغ میں بھیجا تھا؟ آمنہ نے مجھے بتایا تھا کہ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ منظور کہاں چلا گیا تھا۔

"ایک بات ذرا بالکل ہی سچ سچ بتا دو رشید!" — میں نے کہا — "آمنہ کیسی عورت ہے؟"

"اگر آپ نے لوگوں سے پوچھا ہے تو سب نے یہ کہا ہو گا کہ آمنہ شریف عورت ہے" — رشید نے جواب دیا — "میں بھی اُسے شریف ہی کہوں گا۔ اگر بدچلن ہوتی تو مجھے اس طرح نہ دھتکارتی لیکن اُس نے اپنی تسکین کے لئے ایک آدمی رکھا ہُوا ہے جس کا نام قیوم ہے۔"

"قیوم تو پاگل ہے۔"

"پاگل بنا ہُوا ہے جناب!" — رشید نے کہا — "اپنے مطلب کا پکا ہے۔"

"میں نے تو سُنا ہے کہ اُسے کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دیتا" — میں نے کہا — "کیونکہ سب اُسے پاگل سمجھتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں حضور!" — اُس نے کہا — "بیٹیوں والے اسی گاؤں میں موجود ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ قیوم آمنہ کے جال میں آیا ہُوا ہے اور میں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا ہوں کہ قیوم آمنہ کے مقابلے میں خدا کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ یہی حال آمنہ کا ہے۔ منظور چونکہ اکیلا تھا اور قیوم کے بھائی وغیرہ بھی

تھے، اس لئے وہ بے چارہ بولتا نہیں تھا۔"

"پھر بھی آمنہ بے اولاد رہی" — میں نے کہا۔

"یہ اللہ کی مار سمجھیں" — رشید نے کہا — "خاوند کو دھوکا دینے والی عورت کا یہی حال ہوتا ہے۔ آپ آمنہ کو میرے سامنے بٹھائیں میں نے آپ کو سچ بات بتا دی ہے کہ میں نے آپ سے کیوں چھپایا تھا کہ منظور میرے پاس آیا تھا۔ آپ خود سوچیں کہ میری یہ بات سُننے سے پہلے ہی لوگوں نے آپ کے دل میں یہ شک ڈال دیا تھا کہ منظور کا قاتل میں ہوں۔"

بہت سے سوال و جواب کے بعد مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے رشید جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ پھر بھی مجھے اِدھر اُدھر سے اور اپنے خفیہ ذرائع سے بہت سی باتوں کی تصدیق یا تردید کرانی تھی۔ رشید نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اُسے حوالات میں بند کر دُوں اور تفتیش جاری رکھوں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ رشید پہ میرا بہت وقت لگ گیا تھا۔ ابھی آمنہ نہیں آئی تھی۔ میں نے گامے شاہ کے جو تین آدمی تھانے میں بٹھا رکھے تھے انہیں باری باری بلایا اور اُن سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ قتل کی رات کے پہلے پہر گامے شاہ کہاں تھا اور کیا اُنہیں معلوم ہے کہ گامے شاہ نے یا تم میں سے کسی نے منظور کو قتل کیا ہے؟"

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے ہم دوسرے طریقے سے تفتیش کیا کرتے تھے۔ یہ تینوں پہلے ہی تھانے کے کاغذوں میں لکھے ہوتے تھے۔ یہ لوگ خدا کو ناراض کر لیتے تھے، تھانیدار کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور اے ایس آئی کو ساتھ رکھا تھا۔ میں سوال کرتا تھا، مشتبہ جواب دیتا تھا۔ میرے اشارے پر اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل مشتبہ کی تھوڑی سی خاطر تواضع کر دیتے تھے۔ ایک کو تو فرش پہ لٹا کر اور اُس کے ہاتھوں پر کرسی کا ایک ایک پایہ رکھ کر اور کرسیوں پہ ہیڈ کانسٹیبل اور اے ایس آئی کو بٹھا کر پوچھ گچھ کی تھی۔

صبح تک یہ بات میرے سامنے آئی کہ گامے شاہ جس طرح دوسری عورتوں کو خراب کرتا تھا اسی طرح آمنہ کو بھی خراب کرنا چاہتا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ قیوم اور مقتول نے کس طرح گامے شاہ کی پٹائی کی تھی۔ گامے شاہ نے ان تین میں سے دو آدمیوں کو تیار کرنا چاہا تھا کہ وہ منظور کو قتل کر دیں۔ اس کے بعد آمنہ کو اغوا کر کے بہت دُور پہنچانا تھا لیکن قتل معمولی واردات نہیں تھی جو یہ جواری چرسی اور چھوٹے موٹے جرم کرنے والے کر گزرتے۔

کوئی بھی تیار نہ ہُوا تو گامے شاہ نے کہا کہ وہ خود انتقام لے گا۔ تینوں نے بتایا کہ اُس شام وہ گامے شاہ کے ہاں گئے تو وہ گھر پر نہ ملا۔ وہ وہاں بیٹھ گئے۔ گامے شاہ بہت دیر سے واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ گامے شاہ نے کہا کہ ایک شکار کے پیچھے گیا تھا۔ اس کے سوا اُس نے کچھ بھی نہ بتایا۔

میں نے گامے شاہ کو تھانے لانے کے لئے آدمی بھیج دیا۔ میں نہانے دھونے اور تھوڑا سا آرام کرنے کے لئے گھر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ آمنہ آئی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ سوچا کہ انتظار میں اُس کا ذرا دماغ ٹھکانے آجائے گا۔

دولت، اچھی سے اچھی عورت

میں دو گھنٹوں بعد واپس تھانے میں آیا۔ گامے شاہ ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے آمنہ کو اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔

"آمنہ!" — میں نے کہا — "میرے دل میں تمہاری ہمدردی پیدا ہو گئی تھی لیکن تم نے سچ پھر بھی نہ بولا .... تم نے کہا تھا کہ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ منظور کہاں چلا گیا ہے۔"

"ہاں جی!" — آمنہ نے کہا — "میں نے یہی کہا تھا۔"

"تم نے خود اُسے رشید کے پاس باغ میں بھیجا تھا" — میں نے کہا — "اب بھی جھوٹ بولنا ہے تو بول دو۔ میں تمہیں نہیں روک سکتا لیکن میں تمہارے سامنے وہ آدمی بٹھا دوں گا جو تمہارے مُنہ پر کہیں گے کہ منظور کو تم نے رشید کے باغ میں بھیجا تھا۔"

آمنہ کی بھی وہی حالت ہوئی جو تھوڑی دیر پہلے رشید کی ہو گئی تھی۔

"آمنہ!" — میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا — "ابھی وقت ہے۔ سچ بولو۔ میں معاملہ گول کر سکتا ہوں۔"

"وہ کہتا تھا کہ میں رشید کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں" — اُس نے کہا — "میں نے اُسے کہا تھا کہ کر لو۔"

"اب یہ بتاؤ" — میں نے کہا — "کہ تمہارا خاوند اپنے دُشمن کے پاس گیا تھا اور دشمن کے باغ میں گیا تھا۔ وہ ساری رات واپس نہیں آیا۔ کیا تم نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کیوں نہیں آیا؟ کہاں رہ گیا ہے؟ اُسے رشید نے قتل کر کے ہی نہ پھینک دیا ہو؟"

آمنہ کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ میں نے دو تین بار اُسے کہا کہ وہ کچھ جواب دے لیکن اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"تم قیوم کو بلا کر اُسے کہہ سکتی تھیں کہ منظور باغ میں گیا تھا اور واپس نہیں آیا" — میں نے کہا — "اور وہ اُسے جا کر دیکھے" — میں نے پوچھا — "تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

مجھے اُس کی حالت دیکھ کر ایسا شک ہُوا جیسے بیٹھے بیٹھے اُس کا دم نکل گیا ہو۔

"تم نے منظور کو مشورہ دیا تھا کہ باغ میں جاؤ اور شام کے وقت جاؤ" — میں نے کہا — "تم نے سوچا یہ تھا کہ وہ شام کے بعد وہاں سے واپس آئے گا۔ اُسے قتل کرنے کے لئے تم نے راستے میں آدمی بٹھا دیا تھا اور وہ آدمی قیوم تھا۔"

آمنہ یکلخت پھٹ پڑی۔

"نہیں نہیں" — اُس نے چیخ نما آواز میں کہا — "ایسا بالکل نہیں ہُوا۔"

"کیا رشید نے اُسے قتل کیا ہے؟"

"نہیں" — اُس کے مُنہ سے نہیں نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ چونک پڑی۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی — "میں گھر بیٹھی تھی۔ مجھے کیا پتہ اُسے کس نے قتل کیا ہے۔"

"میری ایک بات سنو آمنہ!" — میں نے شفقت کے لہجے میں کہا — "تم عورت ذات ہو۔ اچھے خاندان کی عورت ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں، تمہاری عزت کا پورا خیال رکھوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم قاتل نہیں ہو۔ ابھی تم صدمے میں ہو۔ میں تمہیں الگ بٹھا دیتا ہوں۔ آج کا سارا دن سوچو اور مجھے صحیح بات بتا دو۔ میں مسلمان ہونے کے ناطے سے تمہیں یہ مہلت دے رہا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ گرفتاری تو دُور کی بات ہے، میں تمہیں گواہوں میں بھی شامل نہیں کروں گا۔"

اُس کی حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ اُس نے میری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا۔ اُسے کہا کہ اس بی بی کو عزت سے اپنے پاس بٹھاؤ۔ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ اور اس کا پورا خیال رکھو۔ تھانے کا ہر آدمی الفاظ اور اشارے سمجھتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل سمجھ گیا کہ اس عورت کو حراست میں رکھنا ہے۔

گامے شاہ آ گیا تھا۔ میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ یہ قتل گامے شاہ نے نہیں کیا لیکن قتل کے وقت کے لگ بھگ وہ کلہاڑی لے کر کہاں گیا تھا؟ میں نے اُسے اندر بلایا اور اُس کے سامنے یہ سوال رکھا۔ اس نے ایک گاؤں کا نام لیا کہ وہاں وہ اپنے ایک مرید کے گھر گیا تھا۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا۔ اُسے گاؤں کا نام بتایا اور گامے شاہ سے اُس کے مرید کا نام معلوم کر کے کہا کہ سائیکل پہ اس گاؤں جاتے اور اس شخص کو بلا لاتے۔

"ذرا ٹھہرنا حضور!" — گامے شاہ نے کہا — "میں اس گاؤں میں نہیں گیا تھا۔ بات کچھ اور تھی۔"

وہ بنچ پر بیٹھا ہُوا تھا اور میں اپنے دفتر میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ میں نے اُس کے مُنہ پر اُلٹا ہاتھ مارا، پھر سیدھے ہاتھ کا ایک تھپڑ مارا اور گامے شاہ بنچ سے فرش پر جا پڑا۔ وہ اُٹھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے اصل بات یہ بتائی کہ وہ اُس گاؤں کی ایک عورت کی ملاقات کے لئے گیا تھا جس نے اُسے گاؤں سے باہر ملنا تھا۔ اُسے اس عورت کے انتظار میں زیادہ دیر وہاں کھڑا رہنا پڑا۔ وہ کلہاڑی ساتھ اپنی حفاظت کے لئے لے گیا تھا۔

"اب حضور کی مرضی ہے کہ اس عورت کو یہاں بلا لیں یا کسی اور ذریعے سے اُس سے پوچھ لیں کہ میں اُس کے پاس گیا تھا یا نہیں" — گامے شاہ نے کہا — "میں آپ کو اُس کا نام بھی بتا دیتا ہوں۔"

گامے شاہ نے تسلیم کیا کہ اُس نے آمنہ کو خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اُس کی اصلیت جانتا تھا جس کا اُسے بھی احساس تھا۔ اُس نے صاف الفاظ میں کہا کہ یہ تو کاروبار ہے جس میں پیسہ بھی ہے، عیاشی بھی۔

"اور جناب!" — اُس نے کہا — "یہ لڑائی اور مار پٹائی تو میرے کاروبار کا ایک حصّہ ہے۔ کہیں سے دولت ہاتھ آ جاتی ہے۔ اچھی سے اچھی عورت ہاتھ آ جاتی ہے اور کہیں سے جُوتے بھی پڑ جاتے ہیں۔ میں کسی کو قتل کر کے اپنے کاروبار کا بھٹہ تو نہیں بٹھانا چاہتا۔"

میں نے گامے شاہ کو چھوڑا نہیں۔ اُسے شاملِ تفتیش رکھا اور باہر بٹھا دیا۔ اس وقت میری توجہ آمنہ پر مرکوز تھی۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں فوراً! اس تفتیش کے جھنجھٹ سے نکل آؤں گا اور شام تک قاتل میری حوالات

میں ہوگا لیکن ڈکیتی کی ایک واردات کی تفتیش میں کوئی پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ علاقہ ڈی ایس پی نے اس کی رپورٹ مانگی تھی۔ یہ کیس میرے جونیئر سب انسپکٹر کے پاس تھا۔ میں اس میں مصروف ہوگیا اور چار پانچ گھنٹے گزر گئے۔

آمنہ نے دماغ حاضر رکھا

دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں دفتر میں بیٹھا یہ ارادہ کر رہا تھا کہ آمنہ کو بلاؤں اور اُسے سچ بولنے پر آمادہ کروں۔ اتنے میں طوفان کی طرح ایک آدمی میرے دفتر میں داخل ہُوا اور میری کُرسی پہ اس طرح آکر بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔ اُس نے میز پہ بڑی زور سے ہاتھ مارا تب میں نے دیکھا کہ وہ قیوم ہے۔

"آمنہ کو تھانے سے نکالو اور مجھے گرفتار کرلو" — اُس نے کہا — "منظور میرے ہاتھوں قتل ہُوا ہے۔"

یہ خوشی اور کامیابی کا ایسا شدید دھچکا تھا جیسے قیوم نے میرے سر پر ڈنڈہ مارا ہو۔ یقین کریں کہ مجھ جیسا سخت دل آدمی بھی کانپ گیا۔ یہ سوچ کر مجھے مایوسی ہوتی کہ اس شخص کا تو دماغی توازن ہی درست نہیں اور اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے اور یہ واہی تباہی بکنے پر آگیا ہے۔

"ذرا آرام تو کرلو قیوم بھائی!" — میں نے بڑے پیار سے کہا — "تم شاید گاؤں سے دوڑتے ہوئے آتے ہو۔"

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں اپنی گھوڑی پر آیا ہوں۔ میں نہیں دوڑا، میری گھوڑی سرپٹ دوڑتی آئی ہے ... میں نے کہا ہے آمنہ کو چھوڑ دو۔"

وہ کوئی اور بات سُن بھی نہیں رہا تھا اور کر بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے پیار اور محبت کی باتیں کر کے اُس کے مُنہ سے ذرا اطمینان کی باتیں نکلوائیں۔ پتہ چلا کہ میں نے آمنہ کو جب حراست میں بٹھایا تھا تو اُسی علاقے کے کسی کانسٹیبل نے گاؤں کے اُن لوگوں کو جو تھانے کے باہر کھڑے تھے

بتا دیا کہ آمنہ نے جُرم کا اقبال کر لیا ہے اور اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی گاؤں پہنچا۔ اُس نے آمنہ کے گھر جاکر اطلاع دی۔ قیوم کو پتہ چلا تو یہ گھوڑی پر سوار ہُوا اور آمنہ کے دوسرے رشتہ داروں سے پہلے تھانے پہنچ گیا۔

"قیوم بھائی!" — میں نے کہا — "اگر اپنی عقل اور ہوش میں ہو تو بات کرو۔"

"میں بالکل ہوش میں ہوں تھانیدار صاحب!" — اُس نے پھر میز پر ہاتھ مار کر کہا — "لوگوں نے مجھے پاگل پاگل کہہ کر پاگل ہی بنا دیا ہے۔ آپ میری بات سُنیں، مجھے گرفتار کریں اور آمنہ کو چھوڑ دیں۔"

قیوم کے اقبالِ جُرم کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پہلے سُنا چکا ہوں، باقی باتیں سناتا ہوں۔ یہ تو آپ کو اچھی طرح سنایا جا چکا ہے کہ منظور رشید سے کس قدر تنگ آچکا تھا۔ وہ سارا غبار اپنے اندر روکتا رہا تھا۔ ایک روز آمنہ نے قیوم سے کہا کہ رشید کو قتل کرنا ہے۔ اُس نے قیوم کو اچھی طرح بھڑکایا کہ اُسے دشمنی کی ساری وجوہات سنائیں۔ پھر یہ بتایا کہ رشید نے آمنہ کے گھر میں آکر اُس کے ساتھ کیسی بے ہودہ حرکتیں کی تھیں۔ پھر اُسے یہ کہا کہ رشید کو قتل نہ کیا گیا تو وہ منظور کو قتل کر دے گا۔

قیوم آمنہ کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ وہ تیار ہوگیا۔ منظور کے ساتھ بات ہوتی۔ ان لوگوں نے سکیم یہ بنائی کہ رشید سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے باغ سے گھر واپس آیا کرتا ہے۔ اگر وہ رات کو واپس آئے تو اُسے راستے میں قتل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا یہ طریقہ سوچا گیا کہ منظور رشید کے پاس باغ میں جائے گا اور اُسے کہے گا کہ میں دشمنی ختم کرنے آیا ہوں۔ اس طرح منظور ایسی باتیں کرے گا کہ رشید کو شام کے بہت بعد تک باغ میں روکے رکھے گا۔ قیوم راستے میں ٹیلوں کے علاقے میں چھُپ کر بیٹھ جائے گا۔ رشید گزرے گا تو قیوم پیچھے سے اُس پر کلہاڑی سے حملہ کرے گا۔

اس سکیم کے تحت منظور رشید کے پاس باغ میں گیا تھا۔ قیوم جا کر چھپ گیا۔ اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تو ایک آدمی وہاں سے گزرا جہاں قیوم چھپا ہوا تھا۔ اندھیرے میں صورت تو نہیں پہچانی جا سکتی تھی، قدبُت اور ڈیل ڈول رشید جیسی تھی۔ قیوم نے پیچھے سے کلہاڑی کا پہلا وار گردن پر کیا۔ وہ آدمی آگے جھکا۔ قیوم نے دوسرا وار اُس کے سر پر کیا۔ وہ آدمی گرا اور تڑپنے لگا۔

قیوم کو اندازہ تھا کہ اب یہ جلدی مر جائے گا۔ اُس کے دونوں وار بڑے زوردار تھے۔ وہ پہلے ساتھ والے برساتی نالے میں گیا۔ وہاں کلہاڑی دھوئی۔ پھر اس پر ریت ملی۔ پھر اسے دھویا اور اس کے بعد وہ منظور کے گھر چلا گیا۔ وہاں اُس نے اپنے کپڑے دیکھے۔ قمیض پر خون کے چند ایک دھبے تھے جو آمنہ نے فوراً دھو ڈالے۔ کلہاڑی منظور کی تھی۔ آمنہ اور قیوم بہت خوش تھے کہ انہوں نے دشمن کو مار لیا ہے۔

اُس وقت تک منظور کو واپس آ جانا چاہیئے تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ منظور باغ سے اُٹھے گا اور دوسرے راستے سے واپس آئے گا۔ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ پھر دو تین گھنٹے گزر گئے تب آمنہ نے قیوم سے پوچھا کہ اُس نے رشید کو پہچان کر حملہ کیا تھا؟ قیوم نے اُسے بتایا کہ وہاں سے رشید نے ہی گزرنا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ غلطی سے کسی اور کو مار آیا ہو۔

جب کچھ اور وقت گزر گیا تو آمنہ نے قیوم سے کہا کہ جا کر دیکھو، کہیں غلطی ہی نہ لگی ہو۔ قیوم پاگل پن کی حد تک دلیر آدمی تھا۔ وہ ماچس لے کر چل پڑا۔ فاصلہ کوئی زیادہ نہیں تھا۔ لاش وہاں پڑی ہوئی تھی۔ قیوم نے ماچس جلا کر چہرہ دیکھا تو وہ منظور تھا۔ منظور زندہ ہوتا تو وہ بتاتا کہ اس راستے سے کیوں واپس آیا تھا۔ اُسے تو دوسرے راستے سے واپس جانا تھا یا قیوم غلط جگہ گھات میں بیٹھ گیا تھا۔ یہ معمہ حل کرنا ناممکن تھا۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس کا وقت پورا ہو گیا تھا وہ اس ذہنی مریض کے آگے آ گیا۔ رشید اور

منظور کے قدبُت ایک جیسے تھے۔

قیوم دوڑتا ہوا آمنہ تک پہنچا اور اُسے بتایا کہ غلطی سے منظور مارا گیا ہے۔ آمنہ کا جو حال ہونا تھا وہ تو ہوا لیکن اُس نے قیوم کو بچانے کی ترکیب سوچ لی۔ اُس نے قیوم سے کہا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے اور بالکل چُپ رہے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ رشید کی منظور کے ساتھ کتنی گہری دشمنی ہے۔ میں بھی اپنے بیان میں یہی کہوں گی کہ منظور کو رشید نے قتل کیا ہے۔

قیوم کا جو ردِ عمل تھا وہ اُس نے پوری طرح سنایا۔ یہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بات بتاتا ہوں کہ وہ آمنہ کے قدموں میں سر رکھتا اور روتا تھا اور کہتا تھا کہ آمنہ! اس کلہاڑی سے میری گردن کاٹ دو۔ چونکہ وہ صرف آمنہ کی بات سمجھتا اور مانتا تھا اس لئے آمنہ نے اُس پہ قابو پا لیا اور اُسے ٹھنڈا کر کے گھر بھیج دیا۔

قیوم کو حراست میں لے کر میں نے آمنہ کو بلایا اور اُسے قیوم کا بیان سنایا۔ کچھ پس و پیش کے بعد اُس نے بھی بیان دے دیا۔ اُس نے کہا کہ منظور رشید کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اکیلا تھا اور اُسے آمنہ کا بھی خیال آتا تھا۔ ایک روز اُس نے آمنہ سے کہا کہ قیوم اُس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ اُسے قتل کے لئے استعمال کرے۔ آمنہ کو منظور سے اتنی محبت تھی کہ اُس کی بات مان گئی اور اُس نے قیوم کو رشید کے قتل کے لئے تیار کر لیا۔

انہوں نے جو سکیم بنائی اور قیوم کے ہاتھوں جس طرح سکیم اُلٹ گئی وہ آپ سُن چکے ہیں۔ آمنہ کا سہاگ تباہ ہو گیا لیکن اُس نے اتنے شدید صدمے میں بھی قیوم کو بچانے کی سوچ لی۔ منظور کا خیال تھا کہ رشید کو اس طریقے سے قتل کرائے گا تو کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ قاتل کون ہے۔

میں نے آمنہ اور قیوم کے اُن بیانات پر غور کیا جو انہوں نے پہلے دیتے تھے تو مجھے خیال آیا کہ آمنہ نے خاوند کی موت کے صدمے میں بھی دماغ حاضر رکھا اور مجھے گمراہ کیا۔ قیوم کو سب پاگل سمجھتے تھے لیکن اُس نے

عقل مندی سے جھوٹ بولا تھا۔

مجھے آج بھی شک ہے کہ آمنہ نے منظور کو مروانے کے لئے باغ میں رشید کے پاس شام کے وقت بھیجا تھا اور قیوم سے کہا کہ وہ گھات میں بیٹھے اور منظور کو قتل کر دے۔ تفتیش میں مجھے جو باتیں معلوم ہوتی تھیں، ان میں کچھ میرے اس شک کے حق میں جاتی ہیں اور کچھ اس کی تردید کرتی ہیں۔

میں نے مقدمہ ۳۰۲ (قتل) کا تیار کیا تھا۔ قیوم نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان دے دیا تھا۔ میں نے آمنہ کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ قیوم سے کہا تھا کہ وہ اپنے بیان میں آمنہ کا ذکر نہ کرے۔ یہ کہے کہ اُسے منظور نے قتل پر اُکسایا تھا۔

قیوم کو سیشن کورٹ نے عمر قید دی تھی لیکن ہائی کورٹ نے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

کس کا خاوند کس کی بیوی

مَیں آپ کو اپنی تفتیش کی کہانیاں تو اپنے وقتوں کی سنایا کرتا ہوں لیکن میری طرح آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کہانی کوئی ایک بھی پرانی نہیں لگتی۔ سائنس اور تعلیم نے ہمیں پسماندگی سے نکال کر معلوم نہیں کہاں پہنچا دیا ہے لیکن ہم نے اپنے بناتے ہُوئے معاشرتی اصولوں اور اپنی عادتوں پر نہ سائنس کا اثر ہونے دیا ہے نہ تعلیم کا۔ میری جوانی کے وقتوں میں کسی کی بیٹی، بہن یا بیوی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگتی تھی تو وہ پیدل جاتی تھی یا گھوڑے پر۔ لڑکیاں آج بھی اُسی طرح گھروں سے بھاگ رہی ہیں لیکن سائنس اور تعلیم نے اُن کی یہ مدد کی ہے کہ وہ کاروں اور ہوائی جہازوں پر بھاگتی ہیں۔ پہلے لوگ کلہاڑیوں سے قتل ہوتے تھے اب کلاشنکوف سے ہوتے ہیں۔ چھُری کی جگہ چھُرے آگئے ہیں۔

کئی بار ایک بات کہنے کا ارادہ کیا ہے لیکن اس لئے چُپ رہا کہ مولوی صاحبان ناراض ہوں گے لیکن آج میری ڈائری اور ذہن میں محفوظ یادوں سے یہ کہانی اُبھر کر سامنے آئی جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں۔ میں اس بات کو جسے ہمیشہ دباتا رہا ہوں آج کہہ ہی دیتا ہُوں۔

اُدھر یورپ کا معاشرہ ہے جس میں بیوی کو خاوند سے یا خاوند کو بیوی سے ایسی شکایت ہوتی ہے جس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تو وہ طلاق کے ذریعے فوراً الگ ہو جاتے ہیں حالانکہ اُن کی شادیاں اپنی پسند کی شادیاں ہوتی ہیں۔ اسے وہ محبت کی شادیاں کہتے ہیں۔

اِدھر ہم لوگ ہیں کہ کئی شادیاں بے جوڑ ہوتی ہیں۔ نہ لڑکی کی پسند

کا خیال رکھا جاتا ہے نہ لڑکے کی پسند کا۔ رشتے برادری کی پابندیوں میں طے ہوتے ہیں۔ یوں بھی ہوتے دیکھا ہے کہ لڑکی چودہ پندرہ سال کی ہے اور دولہا تیس کے قریب پہنچ رہا ہے یا دُولہا سترّہ اٹھارہ سال کا ہے اور دلہن آٹھ دس سال بڑی ہے۔ پھر ہمارے ہاں وٹہ سٹہ بھی ہے۔ شادی تو ہو جاتی ہے لیکن میاں بیوی اجنبیوں کی طرح اکٹھے رہتے ہیں۔ خاوند کا دل کہیں اور تھا، بیوی کا کہیں اور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیوی کہیں اور دل خوش کرتی ہے اور خاوند کہیں اور وقت گزارتا ہے۔ پھر ناجائز تعلقات کے شبہے میں قتل کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ بعض بیویاں خاوندوں کو چھوڑ کر بھاگ بھی جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں شادی کا دن مقرر ہو جاتے تو اُس دن سے پہلے ہی غائب ہو جاتی ہیں۔

دو تین مہینے گزرے ہیں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ بارات آئی اور دُلہن غائب ہو گئی۔ بارات کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑا۔ زبردستی کی شادیوں کے یہی نتیجے ہوتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ لڑکی اگر اپنی پسند یا ناپسند بتاتے تو یہ غیر اسلامی فعل ہے۔ پھر خاوند چاہے اُس کے ساتھ کیسا ہی سلوک کرے، لڑکی بول نہیں سکتی۔

لڑکیوں کو چھوڑیں لڑکوں کو بھی اجازت نہیں کہ وہ اپنی رفیقہ حیات کا انتخاب خود کر سکیں خواہ ساری عمر جلتے کڑھتے گزار دیں یا راتوں کو دیر سے گھر آیا کریں اور جہاں جی چاہے جھک مارتے رہیں لیکن بیوی کسی ردِعمل کا اظہار کر دے تو اُسے سو سو طعنے دیتے جاتے ہیں اور فتویٰ یہ لگتا ہے کہ اسلام نے عورت کو سر اٹھانے کا یا اپنے دل کی بات کرنے کا حق ہی نہیں دیا۔

میں مسلمان ہوں اور اسلام کے احکام کا پوری طرح پابند ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں یورپ کے معاشرے کو اچھا سمجھتا ہوں میں آپ کو وہ وارداتیں سنایا کرتا ہوں جن کی میں نے تفتیش کی ہے۔ آپ نے اکثر سوچا

ہوگا کہ اگر یوں ہوتا تو یہ واردات نہ ہوتی۔ اب میں آپ کو ایک اور واردات سناتا ہوں۔ فیصلہ خود کریں کہ اگر والدین پہلے سوچ لیتے تو یہ واردات نہ ہوتی۔

اس قصے کی ابتدا یوں ہوئی کہ صبح آٹھ نو بجے کے درمیان کا وقت تھا ایک جوان آدمی عمر تقریباً تیس برس ہو گی ایک دو آدمیوں کے ساتھ تھانے میں آیا اور رپورٹ یہ دی کہ اُس کی بیوی بھاگ گئی ہے۔

"بھاگ جانے سے کیا مراد ہے؟" ——میں نے کہا —— "اکیلی کہیں چلی گئی ہے یا اغوا ہوئی ہے؟"

"نہیں جناب!" —— اُس نے جواب دیا —— "ایک شادی شدہ آدمی کے ساتھ گئی ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اس آدمی کے ساتھ گئی ہے۔"

"وہ بھی گھر سے غائب ہے" —— اُس نے جواب دیا۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"گذشتہ رات" —— اُس نے جواب دیا —— "میں رات بارہ سوا بارہ بجے پیشاب کے لئے اُٹھا تو بیوی بستر پر نہیں تھی۔ اس وقت وہ بیت الخلاء میں ہی جا سکتی تھی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں نے باہر کا دروازہ دیکھا۔ اندر سے زنجیر کھلی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بھاگ گئی ہے۔"

"اُسے کوئی ذہنی تکلیف تو نہیں تھی؟" —— میں نے پوچھا —— "بعض عورتوں کو ایسی ذہنی تکلیف ہوتی ہے کہ وہ باہر نکل جاتی ہیں۔ تم نے باہر جا کر کہیں نہیں دیکھا تھا؟"

"اُسے کوئی ایسی ذہنی بیماری نہیں تھی" —— اُس نے جواب دیا —— "آپ میری یہ رپورٹ لکھیں کہ وہ بھاگ گئی ہے۔"

"رپورٹ تو میں ضرور لکھوں گا" —— میں نے کہا —— "میں یہ سوال اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری رپورٹ کسی غلط فہمی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ چھوٹا سا کوئی واقعہ جب تھانے میں پہنچ جاتا ہے تو سارا شہر سُنتا ہے

اور یہ واقعہ لوگوں کے لئے دلچسپ کہانی بن جاتا ہے۔"

"نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "کوئی غلط فہمی نہیں وہ بھاگ گئی ہے۔"

"تمہاری باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں پہلے ہی شک تھا کہ تمہاری بیوی بھاگ جائے گی" — میں نے کہا — "کسی گھر کی کوئی عورت لاپتہ ہو جاتی ہے تو اُس کے گھر والے ہر اُس جگہ سے معلوم کرتے ہیں جہاں جہاں اُس کے جانے کا امکان یا شک ہوتا ہے۔ کیا تم نے لڑکی کے والدین سے جا کر معلوم کیا تھا کہ وہ ادھر تو نہیں آئی .... تمہارے سُسرال کہاں ہیں؟"

"سُسرال یہیں ہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے وہاں سے معلوم نہیں کرایا۔"

"کیا تم اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہو؟"

"نہیں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "میں والدین سے الگ رہتا ہوں۔"

"وہاں سے تو تم نے پتہ کرایا ہی ہوگا؟" — میں نے کہا — "وہ کسی ناراضگی کی وجہ سے وہاں چلی گئی ہوگی۔"

"آدھی رات کے وقت اُس نے میرے یا اپنے والدین کے گھر جا کر کیا کرنا تھا" — اُس نے کہا۔

"پھر یہ کہو کہ تمہیں پہلے ہی توقع تھی کہ وہ بھاگ جائے گی" — میں نے کہا — "تم نے اُسے گھر سے غائب پایا تو اسی پر مُہر لگا دی کہ وہ بھاگ گئی ہے۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں جناب!" — اُس نے کہا۔

"کیا تمہیں پہلے ہی شک تھا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ بھاگ جائے گی؟"

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "اُس کے ساتھ اس کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔"

"اِس سلسلے کو روکنے کے لئے تم نے کچھ نہیں کیا؟"

"بہت کچھ کیا تھا جناب!" — اُس نے جواب دیا — "اُس کے ماں باپ سے بھی کہا تھا۔ میں نے خود اُسے تین چار بار مارا پیٹا بھی تھا لیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بے ہمت سے آدمی ہو" — میں نے مذاق کے رنگ میں کہا — "اس بات پر تو لوگ بیوی کو بھی اور اُس کے آشنا کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ کیا تم نے اُس آدمی کو کبھی کچھ نہیں کہا تھا؟"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے جناب!" — اُس نے کہا — "میں بے ہمت آدمی ہوں۔ جس آدمی کے ساتھ وہ گئی ہے وہ روپے پیسے والا بدمعاش آدمی ہے۔ لڑکی کے باپ کے ساتھ جب میں نے بات کی تھی تو اُس نے میری بے عزتی کر دی تھی اور دھمکیاں بھی دی تھیں۔ وہ ڈی سی آفس میں ہیڈ کلرک ہے۔ کہتا تھا کہ تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔"

"اچھا تم ملک نور احمد کی بات کر رہے ہو" — میں نے کہا — "تو وہ ہیں تمہارے سُسر!"

اس کے سُسر کو میں جانتا تھا۔ وہ ضلعی شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ یہ شہر اس قصبے سے جہاں میں ایس ایچ او تھا پینتیس چھتیس میل دُور تھا۔ اُس وقت ڈپٹی کمشنر انگریز ہُوا کرتے تھے اور لوگ انہیں شہنشاہِ برطانیہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ڈی سی آفس میں ملازم ہونا ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

"آپ دیکھ لینا" — اس خاوند نے کہا — "وہ کبھی نہیں مانے گا کہ اُس کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ وہ میرے خلاف کوئی پھڈا ڈال دے گا۔"

"میرا ایک مشورہ مانو" — میں نے کہا — "یہ تو تم نے یقین کر لیا ہے کہ وہ بد[illegible] رہتی اور تمہارے ساتھ اُس نے وفا نہیں کی۔ وہ بھاگ گئی ہے تو طلاق [illegible] اور اس کے باپ کے ہاتھ میں دے دو۔"

میں نے اُسے یہ مشورہ تھانیدار کی حیثیت سے نہیں دیا تھا۔ میں ویسے ہی اُس کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

"دل تو میرا بھی یہی کہتا ہے" — اُس نے کہا — "لیکن جناب! وہ تمام زیور جو اُسے اپنے ماں باپ نے اور وہ بھی جو میرے ماں باپ نے اُسے دیا تھا، ساتھ لے گئی ہے۔"

میں نے اس آدمی کو نظروں سے ناپا اور تولا۔ ظاہری طور پر وہ مظلوم اور مسکین لگتا تھا۔ جس کسی کی بیوی بھاگ جاتے اور سارا زیور بھی ساتھ لے جائے اُس کی شکل اسی طرح ہونی چاہیئے تھی جس طرح اس کی بنی ہوتی تھی اور بولنے کا انداز بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن پولیس کی نگاہ عام شہریوں کی نگاہوں سے زیادہ گہرائی میں جایا کرتی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ جو رونی صورت بنا کر تھانے آئے وہ اندر سے بھی رو رہا ہو۔ تھانے میں بعض ظالم مظلوم بن کر آتے ہیں۔

لڑکی دلیر نکلی

یہ آدمی مجھے مظلوم ہی نظر آیا۔ اس کی شادی کو چار سال گزر گئے تھے۔ اس کے سسر ملک نور احمد نے اسے اپنے رعب تلے دبا کر رکھا ہو گا تاکہ یہ اُس کی بیٹی کو طلاق نہ دے دے۔ بیٹی خود سر ہوگی۔ خاوند کے بیان کے مطابق اُس نے ایک آدمی کے ساتھ تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔

بیوی کا خاوند کو چھوڑ کر جانا یا خاوند کا بیوی کو چھوڑ کر بھاگ جانا جرم ہے لیکن اس کیس میں بیوی زیورات بھی لے گئی تھی۔ اس طرح یہ چوری کا کیس بن گیا تھا۔ اس چوری میں ایک اور آدمی شامل تھا جس کے ساتھ یہ عورت بھاگ گئی تھی۔ خاوند پورے وثوق سے کہتا تھا کہ وہ اسی آدمی کے ساتھ گئی ہے۔

میں نے اس آدمی سے جس کا نام زاہد سمجھ لیں (اصل نام یاد نہیں رہا)

وہ تمام باتیں پوچھیں جو اس قسم کی واردات میں پوچھی جاتی ہیں۔ میں نے کیس باقاعدہ طور پر کاغذات میں لینے سے پہلے ضروری سمجھا کہ اُس آدمی کے متعلق معلوم کر لیا جائے جس کے ساتھ اس شخص کی بیوی اس کے بیان کے مطابق بھاگی ہے۔ اُس کا نام کرامت سمجھ لیں۔ کرامت، سلامت، شفاعت اور بشارت جیسا ہی نام تھا۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ قصبے کی واردات تھی جسے لوگ شہر کہتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے افراد تعلیم یافتہ تھے اور دیہاتیوں کی نسبت شائستہ تھے۔ تعلیم سے مراد بی۔اے اور ایم۔اے نہیں۔ اُس زمانے میں تعلیم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ دس جماعتوں تک ہوتی تھی لیکن اُس وقت کے خالص دودھ کی طرح تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم ہوتی تھی۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر کرامت کو بلایا۔ اُس کی بجائے اُس کا باپ اور چھوٹا بھائی آئے۔ دونوں ڈرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کرامت گھر پر نہیں۔ اُنہوں نے ایک ہی بار نہ بتایا کہ وہ رات سے غائب ہے۔ اُنہوں نے کرامت کے خلاف شک اس طرح پکا کر دیا کہ باپ نے کہا کہ وہ صبح سویرے کہیں نکل گیا تھا۔ بھائی نے کہا کہ رات کھانا کھا کر نکلا تھا پھر وہ نہیں آیا۔

میں نے باپ اور بیٹے کے بیان الگ الگ لئے تھے۔ باپ سے پوچھا کہ اُس نے جھوٹ کیوں بولا ہے کہ کرامت صبح سویرے کہیں گیا ہے۔ باپ پریشان ہو گیا اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسی سے باپ کی بے بسی اور مجبوری سمجھ گیا۔

"یہ بیٹا مجھے معلوم نہیں اور کہاں کہاں ذلیل کرائے گا" — اُس کے الفاظ اور اُس کے چہرے کا تاثر مجھے آج تک یاد ہے۔ اُس نے کہا تھا — "آج اُس نے تھانے چڑھا دیا ہے۔ میں نے تو بڑی عزت سے زندگی گزاری تھی۔ آج اُس کی خاطر مجھے جھوٹ بھی بولنا پڑا۔ یہ جھوٹ میں نے اس لئے بولا

ہے کہ تھوڑی دیر پہلے پتہ چلا ہے کہ زاہد کی بیوی لاپتہ ہے۔ یہ بات ابھی زیادہ مشہور نہیں ہوئی۔ میرے دل نے کہا کہ میرا بیٹا شام کے بعد گھر سے نکلا تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ زاہد کی بیوی اسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے"۔

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ زاہد کی بیوی آپ کے بیٹے کے ساتھ بھاگ سکتی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "آپ ان کی پچھلی ہسٹری سنا دیں تو معاملہ ذرا واضح ہو جائے گا"۔

وہ معزز اور شائستہ آدمی تھا۔ میں اُسے پورا احترام دے رہا تھا اور وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ اُس کے بیٹے کو میں گرفتاری سے بچا لوں گا۔ یہ ایک جھوٹی تسلی تھی۔ گرفتار کرنا نہ کرنا بعد کا معاملہ تھا۔

اس معزز آدمی نے بتایا کہ اُس نے اپنے بیٹے کرامت کی شادی، چار سال گزرے، ایک شریف، سلیقہ شعار اور اچھی شکل و صورت کی لڑکی کے ساتھ کرائی تھی لیکن اسے کرامت نے دل سے قبول نہ کیا۔ اس کی وجہ اس شخص نے یہ بتائی کہ وہ اس لڑکی منوری کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جو لاپتہ ہے۔ شادی سے پہلے منوری اور کرامت کی میل ملاقات بھی تھی۔ ان لوگوں نے منوری کا رشتہ مانگا تھا جو نہیں مل سکا تھا۔ یہ ایک ہی برادری تھی۔ رشتہ مل جانا چاہیئے تھا لیکن ان کی کوئی پرانی سیاست چل رہی تھی۔ منوری اور کرامت کی محبت یا پسندیدگی کو اس سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

"پھر جناب!" ــــ کرامت کے باپ نے کہا ــــ "میرے بیٹے اور منوری کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ منوری بڑی دلیر نکلی۔ اُس نے اپنے خاوند کی پرواہ نہ کی اور کرامت کے ساتھ تعلقات جاری رکھے۔ منوری کی اپنے خاوند کے ساتھ آتے دن جھک جھک ہونے لگی۔ میں اپنے بیٹے کو سمجھاتا تھا تو وہ سنتا ہی نہیں تھا۔ اپنی بیوی میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔

اس کی بیوی بے چاری صبر شکر کر کے بیٹھی تھی۔ ایک بچہ ہو گیا تو بھی میرے بیٹے نے گھر کو گھر نہ سمجھا۔ منوری کے جال میں ایسا آیا کہ اپنے ماں باپ اور بیوی بچے کو بھول گیا"۔

"منوری کے باپ کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی بیٹی کیا گُل کھلا رہی ہے؟"

"جناب!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اس شخص میں تو غیرت نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ ڈپٹی کمشنر کی ہیڈ کلرکی نے اُس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ لوگ اپنے کسی نہ کسی کام کے لئے اُسے سلام کرتے ہیں۔ بعض سے وہ رشوت بھی لے لیتا اور اُن کے کام کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں جناب! جس گھر میں غرور اور حرام آجاتے وہاں سے غیرت نکل جاتی ہے۔ وہ شاید اس پر بھی فخر کرتا ہو گا کہ اُس کی بیٹی اپنے خاوند کو پلے نہیں باندھتی"۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کرامت منوری کو لے کر کہاں گیا ہو گا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا ــــ "جبل پور چھاؤنی میں اُس کا ایک چچا زاد بھائی فوج میں ہے۔ اُس کے ساتھ کرامت کا گہرا دوستانہ ہے۔ وہ چھٹی آتا ہے تو یہ دونوں ہر وقت اکٹھے رہتے ہیں"۔

ابھی تو میں نے تفتیش کرنی تھی لیکن ملزم یا مشتبہ کا باپ خود ہی کہہ رہا تھا کہ منوری اُس کے بیٹے کے ساتھ ہی گئی ہو گی۔ میں نے ایف آئی آر تحریر کی جو منوری اور کرامت کے خلاف تھی۔ دونوں پر الزامات ایک جیسے تھے۔ ایک خاوند چھوڑ کر بھاگی اور دوسرا بیوی چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اس جرم کے علاوہ دونوں پر چوری کا الزام تھا۔

لڑکا لڑکی ہوٹل میں

یہ کیس سراغرسانی کا نہیں تعاقب اور تلاش کا تھا۔ سراغرسانی اُس کیس میں ہوتی ہے جس میں ملزم کا پتہ ہی نہ ہو۔ اس کیس میں ملزم کا نام پتہ پہلے ہی سامنے آگیا تھا۔ ان دونوں کو ڈھونڈنا اور گرفتار کرنا اور ان سے زیور برآمد کرنا تھا۔ یہ کام سراغرسانی جیسا دشوار تھا۔ سوچنے والی بات یہ بھی تھی کہ بھگوڑے خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی اور بھگوڑی بیوی نے اپنے خاوند سے طلاق نہیں لی تھی۔ ان کی شادی نہیں ہوسکتی تھی لیکن مجھے خیال آیا کہ مذہبی احکام زنجیریں تو نہیں ہوتے۔ یہ تو الفاظ ہوتے ہیں جنہیں دل سے قبول کیا جاتا ہے۔ انہیں بڑی آسانی سے توڑا بھی جاسکتا ہے۔ منوری اور کرامت تو پہلے ہی ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ اسی طرح وہ بغیر نکاح کے میاں بیوی بن سکتے تھے۔

میں نے اشتہار شور وغوغا مختلف تھانوں کو بھجوانے کا انتظام کیا۔ کرامت کے باپ سے کہا کہ وہ کرامت کا فوٹو مہیا کرے۔ زاہد نے بتایا کہ اُس کے پاس منوری کا فوٹو ہے۔ کچھ دیر بعد دونوں کے فوٹو میرے پاس آگئے۔

اُن دنوں میرے تھانے میں کیسوں کی تعداد معمول سے بڑھ گئی تھی۔ جن میں سنگین اور اہم کیس زیادہ تھے۔ ان میں کچھ میرے جونیئر سب انسپکٹر کے پاس اور کچھ اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے پاس تھے۔ میں نے یہ کیس اپنے پاس رکھا۔ میں اس سے بے توجہ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اسے اہم کیسوں کی فہرست میں نہ رکھا۔ ایسے بھگوڑے عموماً ذلیل وخوار ہو کر واپس آجایا کرتے تھے۔ اس کیس میں بھی مجھے یہی اُمید تھی۔

آپ نے ایسے افسانے پڑھے ہوں گے، میں نے یہ حقیقی زندگی میں دیکھا ہے کہ لڑکی لڑکا بھاگ گئے۔ لڑکی زیور اور رقم بھی ساتھ لے گئی۔ کسی

شہر میں جاکر ہوٹل میں ٹھہرے۔ پہلے رقم ختم ہوئی پھر زیور بِک کر ختم ہوا اور لُوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ ایسے کیسوں میں بعض لڑکے لڑکیوں کو ہوٹل والوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر واپس آجاتے تھے۔ آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔

مجھے پوری توقع تھی کہ منوری اور کرامت کے کیس میں بھی ایسے ہی ہوگا۔ البتہ ایک صورت یہ پیدا ہونے کا بھی خطرہ تھا کہ کرامت منوری سے زیور ہتھیا کر اُسے کسی کے ہاتھ فروخت کر آئے گا یا اُسے قتل کر کے لاش کہیں غائب کر آئے گا لیکن ابھی میں نے جائزہ لینا تھا کہ کرامت کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ اس قصبے میں ہی ایک بنک میں ملازم تھا اور ایک انشورنس کمپنی کا ایجنٹ بھی تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر سے یقین کر کے کہ کرامت کے گہرے دوستانہ تعلقات اپنے ایک چچازاد بھائی کے ساتھ ہیں اور وہ فوج میں ہے، اپنے جونیئر سب انسپکٹر انعام الحق کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ جبل پور اس شخص کی یونٹ میں جائے اور معلوم کرے کہ کرامت منوری کو وہاں لے گیا ہے یا نہیں۔

میں نے اس فوجی کی یونٹ کا اور اُس کا اپنا نمبر اُس کے گھر والوں سے معلوم کرا لیا تھا۔ اُس کا باپ خود ہی میرے پاس آگیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے اُس کے بیٹے کا ایڈریس کیوں معلوم کیا ہے۔

"آپ پریشان نہ ہوں" — میں نے کہا — "اُس کے خلاف کوئی الزام نہیں۔ تفتیش کے سلسلے میں اُس سے کچھ پوچھنا ہے۔ آپ کو میں ایک بات سمجھا دوں۔ ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا کہ اُس کو آپ خط لکھ دیں یا تار دے دیں کہ پولیس نے تمہارا ایڈریس لیا ہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ہوشیار ہوجاؤ۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں۔ ایک تھانیدار وہاں جا رہا ہے۔ وہاں سے وہ معلوم کرے گا کہ اس نام پر کوئی خط آیا ہے؟ فوجیوں کی ڈاک پہلے اُن کے دفتر میں جاتی ہے۔"

وہ میری وارننگ کو سمجھ گیا۔

میں نے سب انسپکٹر انعام الحق کو ایک بات سمجھا دی تھی۔ فوج کے انگریز افسر بعض اوقات اپنی یونٹ کے کسی ملازم کو جھوٹ بول کر بچا لیا کرتے تھے۔ یہ میرے ساتھ ہو چکا تھا اور کئی دوسرے تھانیداروں کے ساتھ ہُوا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک فوجی بغیر چھٹی لئے اپنے گاؤں آیا اور ایک آدمی کو قتل کر کے چلا گیا۔ پولیس اُس کی یونٹ میں گئی تو وہاں اُس کے آگے کاغذی اور زبانی شہادت رکھ دی گئی کہ یہ آدمی تو اُس رات فلاں ڈیوٹی پر تھا۔

ایسے فوجی قاتل اپنے صوبیداروں وغیرہ کو دردناک یا اشتعال انگیز کہانی سُنا کر متاثر کر لیا کرتے تھے کہ اُنہوں نے قتل کی واردات کر کے ایک شیطان کو مار دیا ہے۔ بعض انگریز افسر بھی جذبات میں آ کر ایسے قاتلوں کی موقعۂ واردات سے غیر حاضری ثابت کر دیتے تھے۔

میں نے سب انسپکٹر انعام الحق کو اس خطرے سے آگاہ کر کے اُسے کہا تھا کہ اِس یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے ملے۔ میں نے اُسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ کیا کہے اور کس طرح کہے۔

اُسے رخصت کر کے میں نے منوری، کرامت، زاہد، کرامت کی بیوی اور ان کے خاندانوں کے متعلق حالات معلوم کرنے کے لئے مخبروں کو بلانے کا انتظام کیا۔

وہ دن متعلقہ پارٹیوں سے معلومات لیتے گزر گیا۔ اس سے اگلے روز منوری کا خاوند زاہد ایک آدمی کو ساتھ لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ضرور بتائے۔

مجھے یاد نہیں رہا کہ اُس نے کون سے شہر کا نام لیا تھا۔ اُس کا ایک رشتہ دار وہاں کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔

"اُس کا خط آیا تھا کہ وہ رات کی گاڑی سے آ رہا ہے" ــــ اُس آدمی نے بتایا ــــ "یہ کل رات کا ذکر ہے (یعنی جس رات زاہد کی بیوی لاپتہ ہوئی تھی) میرے اس رشتہ دار کے والدین بوڑھے ہیں اور بھائی چھوٹے ہیں اس لئے

اُس نے مجھے لکھا کہ میں اس گاڑی کے وقت سٹیشن پہ آجاؤں۔ اُس کے پاس سامان ہو گا۔ میں چلا گیا۔ گاڑی آئی۔ پلیٹ فارم پر بہت تھوڑے مسافر تھے یا چھابڑیوں والے تھے....

" میں ایک جگہ کھڑا رہا کہ میرا رشتہ دار گاڑی سے اُترے گا تو دیکھ لوں گا۔ وہ نہ اُترا۔ پلیٹ فارم کے ایک طرف سے دو آدمی آئے اور ایک ڈبے میں سوار ہونے لگے۔ اُن کے پہلو میری طرف تھے۔ میں نے دیکھا کہ جو پہلے سوار ہُوا وہ کرامت تھا۔ اُس کے پیچھے جو تھا اُس نے سر پر کھیس یا کمبل اس طرح ڈالا ہُوا تھا کہ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بھی گاڑی میں سوار ہو گیا اور گاڑی چلی گئی۔ میرا رشتہ دار نہیں آیا....

" مجھے کل ہی پتہ چل گیا تھا کہ زاہد کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے۔ آج پتہ چلا کہ کرامت بھی گھر سے غیر حاضر ہے تو میں نے زاہد کو بتایا کہ کرامت کو میں نے اُس رات گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا اور اُس کے ساتھ جو تھا اُسے میں آدمی سمجھا تھا لیکن اب خیال آتا ہے کہ وہ آدمی نہیں عورت تھی۔ اُس کے اوپر کھیس یا کمبل تو تھا لیکن اب میں غور کرتا ہوں تو یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ عورت تھی۔"

میں نے اُس سے کچھ سوال پوچھے جن میں ایک یہ تھا کہ اُن دونوں نے کپڑے کیسے پہنے ہُوتے تھے۔

"روشنی تو تھی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں اُن کے کپڑے بھی اچھی طرح دیکھ سکتا۔ کرامت کو میں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔"

اس شخص کو میں نے گواہوں میں شامل کر لیا اور اُسے بتا دیا کہ وہ شہر سے کہیں باہر جانا چاہے تو مجھے اطلاع دے کر جائے۔ یہ ریل گاڑی جبل پور کی طرف جاتی تھی۔ جبل پور وہاں سے بہت ہی دُور تھا۔ راستے میں گاڑی تبدیل کرنی پڑتی تھی لیکن یہ شہادت مل گئی تھی کہ کرامت اُسی سمت گیا ہے اور وہ اکیلا نہیں گیا۔

میراثیوں کی طرح ہوا بھری

سب انسپکٹر انعام الحق دو روز بعد واپس آیا۔ کرامت وہاں نہیں گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ سیدھا کمانڈنگ آفیسر کے پاس گیا جو انگریز تھا۔

انعام الحق نے پہلے تو انگریزوں کے قانون کی تعریف کی اور کہا کہ انگریزوں نے ہمیں ایک قانون دیا ہے اور اس قانون کا احترام کرنا سکھایا ہے اور پولیس کا محکمہ بنا کر عوام الناس کی جان و مال کی اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ہے ورنہ ہم تو جانگلی لوگ تھے۔ ایک دوسرے کو لُوٹتے اور دھوکہ دیتے رہتے تھے۔

انعام الحق نے میراثیوں کی طرح اس انگریز کمانڈنگ آفیسر میں خوب ہوا بھری۔

"صاحب بہادر!" — اُس نے کہا — "کچھ لوگ شہنشاہِ برطانیہ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ آپ کی یونٹ کے ایک نائیک کے پاس ایک شادی شدہ عورت اغوا کر کے لائی گئی ہے۔"

"لانے والا کون ہے؟" — کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا۔

"وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے" — انعام الحق نے جواب دیا — "اپنی بیوی کو چھوڑ کر وہ ایک اور آدمی کی بیوی کو بھگا کر لے آیا ہے.... صاحب بہادر! یہ ایسا جُرم ہے جس سے اور بھی جُرم نکلیں گے۔ مثلاً جس کی بیوی کو بھگایا گیا ہے وہ بھگانے والے کی بیوی یا بہن کو زبردستی اغوا کر سکتا ہے۔ پھر ایسی دشمنی شروع ہو جائے گی جس میں قتل کی وارداتیں ہوں گی۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ عورت ہماری یونٹ میں لائی گئی ہے؟" — کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا۔

"یقین نہیں صاحب بہادر!" — انعام الحق نے کہا — "شک ہے، یہ شک اس بنا پر کیا گیا ہے کہ آپ کا یہ نائیک ملزم کا رشتہ دار بھی ہے اور

گہرا دوست بھی۔"

"ٹھیک ہے سب انسپکٹر صاحب!" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا — "ہم ابھی معلوم کرائیں گے۔"

اُس نے اُسی وقت متعلقہ آدمی کو اپنے دفتر میں بلا لیا اور اُسے بتایا کہ یہ سب انسپکٹر کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔

"دیکھو جوان!" — کمانڈنگ آفیسر نے اُسے کہا — "اگر یہ عورت تمہارے گھر میں لائی گئی ہے تو اُس کو فوراً حاضر کرو۔ اگر نہیں کرو گے اور عورت اِدھر سے ہی برآمد ہوئی تو ہم تمہیں سول پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اگر سول پولیس تم کو چھوڑ دے گی تو ہم تمہارا کورٹ مارشل کریں گے۔"

"صاحب بہادر!" — اُس نے کہا — "میں فیملی کوارٹر میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں ادھر ہی کھڑا ہوں۔ آپ حکم دیں کہ میرے کوارٹر کی تلاشی لی جائے۔"

اسی طرح کیا گیا۔ اس نائیک کے ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لی گئی۔ صوبیدار میجر، سب انسپکٹر انعام الحق کے ساتھ تھا اور وہ پورا تعاون کر رہا تھا۔ دو کمروں کا تو یہ کوارٹر تھا۔ وہاں کوئی فالتو آدمی یا عورت نہیں تھی۔ اس نائک کی بیوی اور ایک بچہ تھا۔

نائک کی بیوی بہت پریشان ہوئی اور اُس نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ انعام الحق نے اُسے ساری بات بتا دی۔

"پھر آپ اُسے یہاں کیوں ڈھونڈنے آتے ہیں؟" — نائک کی بیوی نے بڑی دلیری سے کہا — "کرامت ہمارا رشتہ دار ہے۔ جیسا وہ بدمعاش ہے ویسی ہی منوری ہے۔ میرے خاوند کی کرامت کے ساتھ دوستی بھی ہے اور قریبی رشتہ داری بھی، لیکن میں نے اپنے خاوند کو صاف کہا ہُوا ہے کہ کرامت کو بیٹھک میں بٹھایا کرو۔ اندر میرے سامنے نہ آئے۔ یہ میں اپنے شہر کی بات سُنا رہی ہوں۔ منوری کے ساتھ اُس کے کرتوت کی وجہ سے

میری بول چال ہی بند ہے۔ اگر وہ یہاں آتے تو میں اس کوارٹر میں نہ ہوتی۔ مجھے آپ کی زبانی معلوم ہُوا ہے کہ وہ دونوں بدکار کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اگر خاوند کو معلوم ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔"

یہ تو یقین ہو گیا کہ کرامت اور منوری وہاں نہیں گئے لیکن انعام الحق کو یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس نائک نے باہر کہیں کرامت کو کرائے پر مکان لے دیا ہو۔ انعام الحق واپس کمانڈنگ آفیسر کے پاس گیا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ ایسا انتظام کر دے کہ اس نائک کے گھر پر اور رات کے وقت اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاتے۔ اگر کرامت اس شہر یا چھاؤنی کے علاقے میں ہُوا تو یہ نائک اُس کے گھر رات کو ضرور جاتا ہو گا۔

یہ انگریز لیفٹیننٹ کرنل بڑا اچھا آدمی تھا۔ اُس نے اُسی وقت صوبیدار میجر کو حکم دے دیا کہ رجمنٹل پولیس کی یہ ڈیوٹی لگا دی جاتے کہ وہ اس نائک پر نظر رکھے اور کوئی مشکوک بات نظر آتے تو صوبیدار میجر کو رپورٹ کرے۔

اس دوران منوری کا باپ ملک نور احمد تھانے میں آیا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا لیکن سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کی حد تک، مگر اب آیا تو ایسے پتہ چلا جیسے پولیس کپتان آگیا ہو۔ اُس نے جواب طلبی کے انداز میں مجھ سے پوچھا کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ میں نے اُسے گول مول سا جواب دیا۔

"ملک صاحب، مجھے یہ معاملہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے شک ہے کہ زاہد نے میری بیٹی کو اور کرامت کو خود غائب کرا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے قتل کرا دیا ہو اور رپورٹ دے دی کہ وہ بھاگ گئے ہیں۔"

"ملک نور احمد صاحب!" — میں نے کہا — "کیا آپ نے کبھی قاتل نہیں دیکھے؟ دو انسانوں کو دو مختلف گھروں سے بیک وقت غائب کرنا، پھر انہیں قتل کرنا کسی پکے اُستاد کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے زاہد کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے اس میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔"

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "آپ نے صرف زاہد کو دیکھا ہے" — اُس نے ایک گاؤں کا نام لیا اور کہنے لگا — "وہاں اس کی

رشتہ داری ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جو قتل اور لڑائی مار کٹائی اور خون خرابے کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اُن لوگوں کی آپس کی دشمنیاں ہی ایسی ہیں۔ اسے وہ غیرت مندی کہتے ہیں اور ہر کسی کے گلے پڑ جانے کو بہادری تصور کرتے ہیں۔"

مجھے یہ خاندان یاد آگیا — ان کا گاؤں میرے ہی تھانے کے علاقے میں آتا تھا۔ ہر تھانیدار کو اس خاندان نے مصیبت میں ڈالا تھا۔ دراصل مصیبت نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ ان کے ہاں قتل کی جو واردات ہوتی تھی اس کے ملزم فوراً پکڑے جاتے تھے۔ اگر کوئی واردات چھپا ہی لیتے تھے تو اُس کے ملزم بھی ایک دو دنوں میں سامنے آجاتے تھے، لیکن زاہد کا ان لوگوں کا رشتہ دار ہونا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اُس نے اپنی بیوی اور کرامت کو غائب یا قتل کرا دیا ہو گا۔ کسی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرے۔

ملک نور احمد کو اسی طرح اور اسی قسم کی بات کرنی چاہیئے تھی کیونکہ منوری اُس کی بیٹی تھی۔ اُس سے یہ توقع تو رکھی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ یوں کہتا کہ جی ہاں، میری بیٹی تھی ہی ایسی۔

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "میں اپنی بیٹی اس شخص کو دے تو بیٹھا تھا لیکن میری بیٹی نے ایک ایک دن ایک ایک سال کے برابر گزارا ہے۔ زاہد اُسے گالیاں بھی دیتا تھا۔ کبھی کبھی ہاتھ بھی اُٹھاتا تھا اور سب سے زیادہ ذلیل اور ناقابلِ برداشت حرکت یہ کرتا تھا کہ اُس پر بدچلنی کا الزام لگاتا تھا۔"

"بدچلنی کا الزام کسی ایک شخص کے ساتھ لگاتا تھا یا وہ ویسے ہی اُسے بدچلن کہتا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"اس کی کوئی ایک بکواس ہو تو میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کیا کہتا تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ خود اتنا بدچلن اور بد دماغ ہے کہ محلّے کا کوئی

شخص اس سے مُنہ نہیں لگاتا۔"

"وہی ہوگا۔"

"وہی نہیں جی!" — ملک نور احمد نے جواب دیا — "پاگل کہیں۔ اُس کے چہرے پر کبھی کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ بات بات پر میری بیٹی کو ٹوکتا رہتا ہے۔ آپ کو میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اسی شک پر وقت ضائع نہ کرتے رہنا کہ میری بیٹی کرامت کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ یہ معاملہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

آدھی رات اور جوان عورت

ملک نور احمد نے میرا مغز اتنا چاٹا تھا کہ میں کچھ سوچنے کے قابل نہ رہا۔ اُس نے مجھ پر اپنی ہیڈ کلرکی کا اور انگریز ڈپٹی کمشنر کا رُعب جمانے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں مَیں نے اُس کا دماغ صاف کر دیا تھا۔ یہ آدمی بہر حال خاصا بیوقوف تھا۔ وہ باتیں تو زاہد کے خلاف کر رہا تھا لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ مجھے کیا تاثر دے رہا ہے۔ زاہد کے محلے کے دو معزز افراد نے اور دو مخبروں نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ زاہد اپنی بیوی کو بہت تنگ کرتا تھا لیکن انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ زاہد میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ منوری کو طلاق دے دے اور یہ بھی کہ وہ منوری پر جو الزام عائد کرتا تھا وہ غلط نہیں تھے۔ کرامت اور منوری کے تعلقات کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں تھا۔ ملک نور احمد زاہد کے خلاف باتیں کرتے کرتے مجھے یہ تاثر دے گیا تھا کہ اُس کی بیٹی اتنی تنگ تھی کہ اس گھر سے بھاگ جانے کے سوا اُس کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔

اُسی روز کا ذکر ہے کہ ان لوگوں کے محلے کا ایک معزز آدمی جو تھانیداروں کو سلام کرنے والا شخص تھا، تھانے میں آیا۔ اُس نے ڈاک کا ایک لفافہ

مجھے دیا۔ لفافہ کھلا ہُوا تھا۔ اس کے اندر ایک خط تھا اور پانچ پانچ روپے کے تین نوٹ بھی لفافے میں پڑے ہوئے تھے۔ لفافے پر ایڈریس کرامت کا تھا۔ لفافہ لانے والے کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جسے یہ لفافہ باہر کھیتوں میں سے ملا تھا۔

ان کے محلے کے ساتھ ہی ایک تو ویسے ہی میدان تھا اور اس کے ساتھ کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ لفافہ فصل کے اندر پڑا تھا۔ اُس وقت گندم کی فصل بمشکل ایک فٹ اُونچی تھی۔ میں نے سوچا بعض لوگ خط پڑھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ خط کھیتوں میں پہنچ گیا ہوگا لیکن یہ لفافہ پھینکنے والا نہیں تھا کیونکہ اس میں پندرہ روپے رکھے ہُوتے تھے۔ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی اور میں اُسی وقت اُٹھا اور وہاں چلا گیا جہاں لفافہ پایا گیا تھا۔

میں نے وہاں دیکھا۔ گندم کے چھوٹے چھوٹے پودے ٹوٹے ہوتے تھے اور یہ صرف ایک جگہ سے ہی ٹوٹے ہُوتے نہیں تھے بلکہ صاف نظر آتا تھا کہ اس کھیت میں سے دو یا تین آدمی گزرے ہیں۔ پودے چونکہ ابھی چھوٹے تھے اور کچے اس لیے پاؤں تلے مسلے گئے پھر اُٹھ نہ سکے۔ دو اور کھیتوں کو دیکھا۔ وہاں بھی پودے اسی طرح ٹوٹے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان لوگوں نے جو یہاں سے گزرے ہیں راستہ چھوٹا کیا ہے۔ اگر وہ مینڈھوں پر چلتے تو انہیں دائیں بائیں گھومنا پڑتا۔

میں ٹوٹے ہوتے فصل میں آگے چلتا گیا۔ جہاں سے لفافہ ملا تھا وہاں سے تقریباً دو سو گز دُور سلیپر کا ایک پاؤں ملا۔ اُس وقت لوگ گھروں میں اسی طرح کے سلیپر پہنا کرتے تھے۔ اگر یہ سلیپر پرانا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ پرانا ہونے کی وجہ سے پھینک گیا ہے لیکن یہ بالکل نیا تھا۔

یہ اُٹھا کر مَیں آگے چلا گیا جہاں کھیت ختم ہوتے تھے وہاں سے آگے زمین گز ڈیڑھ گز نیچے ہو گئی تھی۔ یہ ایک ڈھلان سی تھی۔ آگے جھاڑیاں تھیں۔

سلیپر کا دوسرا پاؤں ان جھاڑیوں سے ملا۔ میں وہیں رُک گیا اور اُس آدمی کو جسے لفافہ ملا تھا یہ کہہ کر دوڑایا کہ کرامت کے باپ اور بھائیوں کو یہاں لے آؤ۔ اُسے تو دوڑا دیا، لیکن مجھے خیال آگیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے ماں باپ سے الگ رہتا ہے۔ میں نے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ اُس کی بیوی بتا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں محلّے کی طرف چل پڑا۔ میرے ساتھ جو معزز آدمی تھا وہ میرے کہنے پر مجھے کرامت کے گھر لے گیا۔ میں نے کرامت کی بیوی کو اپنے پاس بٹھالیا اور اس معزز آدمی سے کہا کہ کرامت کے باپ وغیرہ کو وہیں لے آئے۔

میں نے سلیپر کرامت کی بیوی کے آگے رکھ کر پوچھا کہ کرامت ایسے سلیپر پہنا کرتا تھا؟

"یہ اُسی کے معلوم ہوتے ہیں" — کرامت کی بیوی نے جواب دیا — "گھر سے لاپتہ ہونے سے دو تین روز پہلے ہی اُس نے سلیپروں کا یہ جوڑا خریدا تھا۔"

"کیا گھر میں اس کی کوئی اور جُوتی ہے؟"

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا — "اُس کے شُوز کے دونوں جوڑے گھر میں پڑے ہیں۔"

میرے کہنے پر وہ دونوں جوڑے اُٹھا لائی اور میرے آگے رکھ دیئے۔ میں نے سلیپر اور شُوز کے تلے ایک ساتھ ملا کر دیکھے۔ سائز ایک ہی تھا۔

"کرامت کے پاس شُوز کے کتنے جوڑے ہیں؟" — میں نے شاید ویسے ہی یا شاید کسی خیال کے تحت یہ سوال پوچھا تھا۔

"باہر پہننے کے لئے یہی دو جوڑے ہیں" — کرامت کی بیوی نے جواب دیا — "ویسے وہ گھر میں یا محلے میں سلیپر ہی پہنتے تھے۔"

"نہیں" — میں نے کہا — "پھر سوچ لو۔ اُس کی کوئی اور جُوتی بھی ہوگی۔"

"نہیں جی!" — کرامت کی بیوی نے کہا — "اُس کے پاس یہی کچھ ہے جو میں نے آپ کو دکھا دیا ہے۔"

"ذرا یاد کرو" — میں نے کہا — "جس رات وہ گھر سے لاپتہ ہُوا ہے وہ کیا پہن کر نکلا تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے" — اُس نے جواب دیا — "پاؤں میں یہ سلیپر تھے۔ پاجامہ اور قمیض پہنی ہوتی تھی جو وہ گھر آکر پہنتے تھے اور ایک پرانی سویٹر تھی۔"

اس طرح کریدتے کریدتے مجھے پتہ چلا کہ کرامت دفتر جاتا تھا تو وہ شلوار قمیض، اچھی قسم کی سویٹر اور کوٹ پہنتا تھا اور اگر اُسے کہیں شہر سے باہر جانا پڑتا تو بھی وہ یہی کپڑے پہنتا تھا۔ اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ وہ ایک عورت کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس شہر میں واپس نہ آنے کے لئے گیا ہے۔ اُسے اچھے کپڑوں میں جانا چاہیئے تھا۔

میں نے کرامت کی بیوی کو لفافہ اور اس میں جو خط پڑا تھا وہ دکھا کر پوچھا کہ یہ محمد اقبال کون ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ کرامت کا ایک دوست ہے اور اسی محلّے کا رہنے والا ہے۔ وہ ضلعی شہر میں ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔

میں نے باہر نکل کر کرامت کے باپ اور بھائیوں سے محمد اقبال کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کی گہری دوستی تھی۔

میں نے آپ کو ابھی تک نہیں بتایا کہ خط میں لکھا کیا تھا۔ خط مختصر تھا۔ خیر خیریت لکھی ہوتی تھی۔ آخری دو فقروں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ وہ فقرے کچھ اس قسم کے تھے کہ تم لے آنے کے لئے کہا تھا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کرو۔

میں نے اُس کی بیوی سے پوچھا تھا کہ اُس رات کرامت کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اُس کی بیوی نے بڑی مایوسی سے بتایا تھا کہ وہ گھر میں صرف کھانا

کھانے اور سونے کے لئے آتا تھا۔ شام کا کھانا کھاتے ہی گھر سے نکل جاتا تھا اور دوستوں میں وقت گزار کر آدھی رات کو واپس آتا تھا۔

مجھے ایک خیال آ گیا جس کے تحت میں ایک بار پھر کرامت کے گھر کے اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی سے کہا کہ اُسکا کوٹ دکھائے۔ وہ کمرے میں جا کر کوٹ لے آئی۔ میں نے کوٹ کی باہر اور اندر والی جیبیں دیکھیں۔ اندر والی جیب میں پیسے پڑے تھے۔ باہر والی ایک جیب میں رومال تھا۔ میں نے کوٹ واپس دے دیا۔ میرے دل نے کہا کہ کرامت خود نہیں گیا، اُسے لے جایا گیا ہے اور یہ معاملہ کچھ اور ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس رات کرامت نے منوری کو کھیتوں میں ملنے کا وقت دے رکھا ہو اور دونوں اکٹھے پکڑے گئے ہوں اور اس طرح دونوں مارے گئے ہوں۔

وہیں محلے کے تین چار آدمیوں نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک آدمی کی بیٹھک میں یہ سب دوست رات کو اکٹھے ہوتے ہیں اور تاش کھیلتے ہیں۔ میں نے اس شک کا اظہار کیا کہ یہ لوگ جوا کھیلتے ہوں گے لیکن سب نے کہا کہ جُوا نہیں کھیلتے۔ اُس بیٹھک کا دروازہ کُھلا رہتا ہے۔ بعض اوقات تماشائی بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اس طرح محفل جمی رہتی ہے۔

معاملہ کچھ اور نکلا

میں نے کرامت کے اُس دوست کا ایڈریس لے لیا تھا جس کا خط آیا تھا۔ تھانے جا کر میں نے اے ایس آئی گوپال داس کو ایڈریس دے کر اُسی وقت روانہ کر دیا کہ اس شخص سے مل کر پوری تحقیقات کرے کہ کرامت اُس کے پاس گیا ہے یا نہیں۔ پھر میں نے کرامت کے اُن تین چار دوستوں کو بلایا جن کے ساتھ وہ تاش کھیلا کرتا تھا۔

وہ جب آئے تو میں نے باری باری اُن سے پوچھ گچھ کی۔ اس کی تفصیل سنانے کی ضرورت نہیں۔ ان سب نے جو بیان دیئے ان سے یہ انکشاف ہُوا کہ اُس رات کرامت ساڑھے بارہ بجے تک تاش کھیل کر وہاں سے نکلا تھا۔ میں نے ان میں سے ہر ایک سے یہ پوچھا تھا کہ اُس نے یہ وقت کیوں اور کیسے بتایا ہے۔ اُس زمانے میں گھڑی کسی کسی کے پاس ہوتی تھی جس کی بیٹھک میں یہ لوگ تاش کھیلتے تھے اُس کے پاس گھڑی تھی۔

ان میں سے کسی نے پوچھا کہ وقت کیا ہے۔ گھڑی والے نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ ساڑھے بارہ بجنے والے ہیں۔ تقریباً سب نے کہا کہ بہت وقت ہو گیا ہے۔ اب اُٹھنا چاہیئے۔

ساڑھے بارہ سُنتے ہی میرا دھیان اُس آدمی کی طرف چلا گیا جسے زاہد تھانے لایا تھا اور اُس آدمی نے یہ بتایا تھا کہ اُس نے زاہد کو گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑی کا وقت سوا گیارہ بجے تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اُس دَور میں گاڑیاں لیٹ نہیں ہوتی تھیں۔

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ میں نے اس کیس کو اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ میں کہتا تھا کہ بھاگنے والی بھی بچی نہیں تھی کہ اُسے بھگانے والا ورغلا کر یا اُٹھا کر لے گیا تھا اور بھگانے والا بھی بچہ نہیں تھا لیکن منوری کا باپ ملک نور احمد ہی عقلمند نکلا جس نے یہ کہا تھا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ کوئی ڈرامہ ہی تھا۔ جو کچھ بھی تھا بہر حال یہ نہیں تھا کہ کسی کی بیوی کسی کے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر اُس آدمی کو بلایا جس نے یہ بیان دیا تھا کہ اُس نے کرامت کو ایک اور عورت کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اپنا لہجہ نرم اور دوستانہ رکھا تاکہ اس شخص پر یہ ظاہر نہ ہو کہ میں نے اُس کا کوئی جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ میں نے اُسے بٹھا لیا۔

"تمہارا شک ٹھیک نکلا" ——— میں نے اُسے کہا ——— "وہ کرامت ہی تھا جو گاڑی میں سوار ہُوا تھا اور اُس کے پیچھے منوری تھی۔"

"ہاں جی، وہ تھا ہی کرامت" ——— اُس نے کہا ——— "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اُسے تو میں نے بڑی اچھی طرح پہچان لیا تھا، لیکن میں منوری کو نہیں پہچان سکا تھا۔"

"اُس رات گاڑی لیٹ ہو گی" ——— میں نے کہا ——— "کیا واقعی لیٹ تھی؟"

"نہیں جناب!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "گاڑی بالکل صحیح ٹائم پر آئی تھی۔"

"گاڑی کا ٹائم سوا گیارہ بجے ہے نا!" ——— میں نے بڑے پیار سے کہا۔

"جی ہاں" ——— اُس نے کہا ——— "سوا گیارہ بجے۔"

"ایک بات بتاؤ" ——— میں نے پوچھا ——— "کیا زاہد تمہارا قریبی رشتہ دار ہے یا دوستی ہے؟"

"نہیں حضور!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "نہ رشتہ داری ہے نہ دوستی ہے۔"

"پھر تم نے یہ بیان کیوں دیا تھا؟"

"وہ اس لئے دیا تھا جناب!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "کہ مجھے پتہ چلا کہ زاہد کی بیوی لاپتہ ہے اور کرامت پر شک کیا جا رہا ہے تو میں نے زاہد کو بتایا کہ کرامت کو تو میں نے اُس رات گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا زاہد نے مجھے کہا کہ تھانے چلو اور انسپکٹر صاحب کو بتاؤ۔ اُس بے چارے نے میری منت کی تو میں اپنا فرض سمجھتے ہُوئے آپ کے پاس آ گیا تھا۔"

"اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ تم سے جھوٹا بیان دلوایا گیا ہے تو تم کیا جواب دو گے؟"

اُس نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ مجھے صاف نظر آیا کہ اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اُس نے میری توقع کے مطابق ہی جواب دیا کہ اُس نے جھوٹا بیان نہیں دیا۔

"میں تمہیں حوالات میں بٹھا دیتا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "آرام سے بیٹھ کر سوچنا۔ جب تمہارا دل مانے مجھے بتا دینا کہ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔ جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں دو گے حوالات میں سے نہیں نکل سکو گے۔ پولیس کو جھوٹا بیان دینا جرم ہے جس کی سزا دو سال تک ہو سکتی ہے۔"

اُس کے چہرے کا رنگ جو پہلے پھیکا پڑ گیا تھا اب لاش کی طرح ہو گیا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔

"گدھے کی اولاد!" ——— میں نے پولیس کے مخصوص لہجے میں کہا ——— "وہ تیرا باپ کرامت ساڑھے بارہ بجے تک ایک دوست کے گھر تاش کھیلتا رہا ہے۔ اس کا ایک نہیں سات آٹھ گواہ ہیں اور تم کہتے ہو کہ تم نے اُسے سوا گیارہ کی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔"

"مجھے کوئی غلطی لگی ہو گی جناب!" ——— اُس نے کہا ——— "وہ کوئی اور ہو گا۔"

"تمہیں غلطی نہیں لگی" ——— میں نے کہا ——— "تم نے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔ اب اس کی سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ غریب سا آدمی تھا۔ شکل وصورت سے چالاک بھی نہیں لگتا تھا۔ میں اب اُس کے ساتھ تھانیداروں کی طرح بات کر رہا تھا۔ تھانے کا خوف بھی اُس پر سوار تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے چین ہو گیا۔ میں اندازہ کر رہا تھا کہ اُس کے اندر کیا زلزلہ آ رہا ہے۔

"میں اتنا زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دوں گا" ——— میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوتے آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھتے ہُوئے کہا ——— "ایک منٹ میں بول پڑو۔"

اُس میں تھوڑی سی جان باقی تھی جس نے اُسے بیہوش نہ ہونے دیا۔ وہ کُرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو جُھکنے لگا جیسے اُسے توقع تھی کہ میں اُسے ماروں گا۔

میں نے دھماکے کی طرح کہا — "بولو۔"

"غریب آدمی ہوں جناب!" — وہ ہاتھ جوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور کانپتی لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا — "بیس روپے ماہوار تنخواہ لیتا ہوں۔ دو اپنے بچے ہیں۔ دو چھوٹے بھائی ہیں۔ اس تنخواہ میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ زاہد نے مجھے کہا تھا کہ اس طرح کا بیان دو تو میں تمہیں پندرہ روپے دوں گا۔ آپ جانتے ہیں حضور! میرے لئے پندرہ روپے کتنی رقم ہے۔ یہ میرے گھر کی پورے مہینے کی ہانڈی روٹی کا خرچ ہے۔ میں نے یہ جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔"

"کیا تم نے اُس سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ تم سے ایسا بیان کیوں دلوا رہا ہے؟"

"اُس نے خود ہی بتایا تھا" — اُس نے جواب دیا — "کہتا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی بیوی کو کرامت لے گیا ہے۔ وہ ایسے گواہ کی تلاش میں تھا جو یہ کہہ دے کہ اُس نے کرامت اور اُس کی بیوی کو رات کی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔ میں حاجت مند آدمی ہوں جناب! میں نے پندرہ روپے لے کر بیان دے دیا۔"

"تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ کرامت کے پیچھے ایک آدمی تھا جو عورت لگتی تھی؟" — میں نے پوچھا — "تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ زاہد کی بیوی ہی تھی؟"

"مجھے جس طرح زاہد نے کہا تھا اسی طرح میں نے کہہ دیا" — اُس نے جواب دیا۔

اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ زاہد چالاک آدمی ہے۔ میں اُسے مظلوم سمجھتا رہا تھا۔

"تمہیں کچھ اور معلوم ہے تو بتا دو" — میں نے جھوٹا بیان دینے والے سے کہا — "بعد میں مجھے پتہ چلا تو گرفتار کر لوں گا۔"

اُس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ وہ اور کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے اپنے اس رشتہ دار کا واقعی خط ملا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اُس کا کوئی رشتہ دار باہر نہیں ہوتا۔

اس شخص کو میں نے تھانے میں بٹھائے رکھا اور زاہد کو تھانے بلایا۔

میری ہنسی نکل گئی

میرے ذہن میں کرامت کے نام کا لفافہ اور اُس کے سلیپر اٹک گئے تھے اور یہ بھی کہ وہ گھر میں پہننے والے کپڑوں میں گیا تھا۔

"زاہد بھائی!" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے اپنے طور پر اپنی بیوی کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں کیسے سراغ لگا سکتا ہوں جی!" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو شہر سے ہی چلے گئے ہیں۔ میں ایک آدمی کو آپ کے پاس لایا تھا جس نے کرامت کو گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔"

"زاہد میاں!" — میں نے کہا — "اس آدمی سے یہ جھوٹ تم نے کیوں بلوایا ہے؟"

وہ جواب دینے کی بجائے میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ذرا ہمت کی۔

"میں نے جھوٹ نہیں بلوایا" — اُس نے رُک رُک کر کہا — "وہ تو اُس نے خود ہی ...."

"اُس نے خود ہی جھوٹ بولا ہے" — میں نے اُس کا فقرہ پورا کرتے

ہوتے کہا ——"اور زاہد! کیوں اُس غریب کو دو سال کے لئے اندر کرا تو گے! عیال دار آدمی ہے۔ اُسے تم نے پندرہ روپے اُجرت دی تھی۔ وہ کام اُس نے کر دیا۔ پندرہ روپوں میں اُسے پولیس کو تفتیش میں گمراہ کرنے اور شہادت میں رخنہ ڈالنے کے جُرم میں سزائے قید نہ دلاؤ۔"

ضمیر پہ جرم کا بوجھ ہو تو زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہ شخص تو تھانے میں بیٹھا تھا۔ ضمیر کے بوجھ کے علاوہ تھانے کی دہشت تھی۔ یہ دہشت اُس وقت بڑی بھیانک صورت اختیار کر لیتی ہے جب تھانیدار کہہ دیتا ہے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے اور جھوٹ بولنے کی وجہ بیان کرو۔ اس شخص کی حالت بڑی تیزی سے بگڑ رہی تھی۔

"زاہد!"—— میں نے اُس کی طرف جُھک کر آہستہ سے پوچھا —— "تمہارے دل میں کیا ہے؛ جو کچھ ہے میرے آگے اُگل دو۔"

"میری بیوی .... جناب! .... وہ .... وہ کہیں .... دیکھیں گے ...."

اُس کی ہکلاہٹ پر میری ہنسی نکل گئی۔

"تمہاری نیت اگر صاف ہوتی تو میرے سوال کا جواب آسان تھا"—— میں نے کہا ——"تم کہتے کہ میں نے آپ کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ میری بیوی واقعی کرامت کے ساتھ گئی ہے ایک جھوٹا گواہ تیار کر کے آپ کے سامنے کھڑا کیا تھا .... پھر میں تمہیں کہتا کہ جھوٹا گواہ لانے کی ضرورت نہیں تھی، مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ تمہاری بیوی بھاگ گئی ہے۔"

"یہی وجہ تھی ملک صاحب!"—— اُس نے اچانک جاندار آواز میں کہا ——"میں ڈرتا تھا کہ آپ ناراض ہوں گے۔"

"لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی نا زاہد!"—— میں نے کہا ——"مجھے کچھ شہادت اور ملی ہے .... کیا تمہیں پتہ نہیں چلا تھا کہ میں آج صبح کرامت کے گھر گیا تھا؟"

"پتہ چلا تھا"—— اُس نے کہا۔

"اور تمہیں شاید یہ بھی کسی نے بتایا ہوگا کہ کھیتوں میں سے کرامت کی کچھ چیزیں ملی ہیں"—— میں نے کہا ——"یہ چیزیں کچھ اور کہانی سناتی ہیں .... پتہ چل جائے گا۔ ابھی اور شہادت آ رہی ہے۔"

میں نے اُس کے چہرے پر ایسی تبدیلی دیکھی جیسے سینما سکرین پر ایک سلائیڈ کے بعد دوسرے رنگ کی سلائیڈ آگئی ہو۔

"ملک صاحب!"—— زاہد نے ایسی آواز میں کہا جو ذرا کانپ رہی تھی —— "میں نے ایک اور بات سوچی ہے۔ یہ بیوی اگر مجھے واپس مل بھی گئی تو اسے کیا کروں گا۔ کیا ایسی بیوی کو کوئی باعزت آدمی اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے جو غیر آدمی کے ساتھ چلی گئی ہو؟ میں طلاق لکھ کر اُس کے باپ کو دے دوں گا اور آپ کو تحریر دے دوں گا کہ میں اپنی بیوی کی گمشدگی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اس لئے میں اپنی رپورٹ واپس لیتا ہوں۔ آپ تفتیش روک دیں۔"

"اور وہ جو تمہارا اتنا زیادہ زیور چلا گیا ہے"—— میں نے کہا۔

"صبر شکر کر لوں گا"—— اُس نے کہا ——"میرا گھر تو تباہ ہو ہی گیا ہے۔"

"پھر جانتے ہو کیا ہوگا؟"—— میں نے کہا ——"تمہارا سُسر تمہارے خلاف رپورٹ لے کر آجائے گا کہ تم نے اُس کی بیٹی کو کہیں غائب کر دیا ہے اور اُس کا زیور تم پی گئے ہو۔"

"میں اُسے زیور دے دوں گا"—— زاہد نے کہا۔

"کہاں سے دو گے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے اُس کے چہرے پر ایک اور تبدیلی دیکھی۔ مجھے شک سا ہونے لگا جیسے اُس نے اپنی بیوی کو بدنام کرنے کے لئے کوئی ڈرامہ کھیلا ہو۔ میں نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور دوستانہ لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ ہمارے درمیان بہت باتیں ہوئیں۔ وہ اسی پر زور

دیتا رہا کہ میں اُس کی رپورٹ منسوخ کر کے تفتیش روک دوں۔ میں اُسے کہتا تھا کہ وہ اپنے سُسر کو کس طرح راضی کرے گا؟ زاہد کہتا تھا کہ وہ اُسے زیور پورا کر دے گا۔

میں اُسے دوستانہ مشورے دے رہا تھا اور اُس کے ذہن کو اپنے قبضے میں لینے کے لئے میں نے اُس کے سُسر ملک نور احمد کے خلاف بہت سی باتیں کیں۔ یہ سن کر وہ ایک ہی بات کہنے لگا کہ میں اُس کی رپورٹ منسوخ کر دوں۔ اس سے میرا شک مزید پختہ ہو گیا۔

میں نے اُس کے ساتھ بے شمار باتیں کی تھیں۔ یہ ساری کی ساری تو نہیں سنائی جا سکتیں۔ میں آپ کو صرف یہ سنانا چاہتا ہوں کہ زاہد نے اپنے خلاف شک پختہ کر دیا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ زاہد اتنا چالاک اور ہوشیار ہے؟ اگر یہ کوئی اور ڈرامہ تھا تو یہ اکیلے زاہد کا کام نہیں تھا۔

وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا تھا اور میں اُس کے ساتھ گفتگو میں بھی مصروف تھا اور میں سوچ بھی رہا تھا۔ مجھے اُس کی پہلے دن کی باتیں یاد آئیں جب وہ اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آیا تھا۔ میں نے یہ باتیں مختصر کر کے اس کہانی کی ابتدا میں لکھی ہیں۔ اس کی بیوی رات کو لاپتہ ہوئی اور وہ علی الصبح سیدھا تھانے آ گیا۔ اُس نے اپنے والدین کے گھر سے معلوم نہیں کیا، بیوی کے والدین کے گھر نہ گیا اور فیصلتہً کہہ دیا کہ وہ کرامت کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ اُس نے کرامت کو دیکھا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہے؟ اُس نے پورے یقین سے کہا کہ کرامت اُس کی بیوی کو نہیں، لے جایا گیا ہے۔ زاہد کے گھر بھی میں نے جوتیوں کو ہی ذریعہ سراغرسانی بنایا تھا۔ یہ لوگ مڈل کلاس کے تھے۔ ان کے ہاں درجنوں کے حساب سے سینڈل وغیرہ نہیں ہو سکتے تھے۔ جس عورت کے پاس چار پانچ جوتیاں اچھی

قسم کی ہوتی تھیں اُسے امیر یا خوشحال عورت سمجھا جاتا تھا۔

منوری کی ماں نے کہا کہ اس کے علاوہ منوری کے پاس کوئی اور جُوتی نہیں تھی۔ میں نے تھوڑی سی جرح کی تو اس ماں نے کہا کہ منوری دوسرے تیسرے روز اس کے ہاں جاتی تھی۔ گھر دُور دُور تو نہیں تھے۔ ایک ہی محلّے میں تھے۔ ماں جانتی تھی کہ بیٹی کے پاس پہننے کو کیا کچھ ہے۔

میں نے منوری کی ماں سے پوچھا کہ منوری کی بہت ہی عزیز اور ہمراز سہیلی کون ہے۔ اُس نے دو لڑکیوں کے نام بتلائے جن میں سے ایک کے متعلق اُس نے کہا کہ یہ اُس کی ہمراز بھی تھی۔ میں نے اُس لڑکی کو بلوا لیا اور اُسے بٹھا کر اُس پر جو خوف سا طاری ہو گیا تھا وہ تسلّی دلاسہ دے کر اُتارا۔

پہلے تو اُسے منوری کی جوتیاں دکھائیں۔ اُس نے تصدیق کی کہ اُس کے پاس یہی سینڈل تھے جن میں ایک زری جوتی تھی اور ایک گھر پہننے والی چپل۔

اِس سے یہ ظاہر ہُوا کہ منوری ننگے پاؤں گئی ہے جو میرے لئے قابلِ قبول نہیں تھا تاہم یہ معمولی سا اور کچا سا اشارہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اُس نے بھاگنے سے ایک آدھ دن پہلے کوئی جُوتی خریدی ہو جس کا اُس کی ماں لیکن زاہد کی حرکتوں اور اس کی حالت مجھے یقین دلا رہی تھی کہ یہ کچھ اور ہی گڑبڑ ہے۔

اُس کے گھر تک پہنچتے وہ کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں صرف یہ بات سمجھ سکا کہ پولیس کا کسی کے گھر جانا بے عزتی کا باعث ہوتا ہے باقی اُس نے جو کچھ بھی کہا وہ میں نہ سمجھ سکا اور میں نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اُس کے گھر میں داخل ہُوتے تو صحن میں ایک نوجوان اور دو آدمی اُس سے زیادہ عمر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ نوجوان شکل و صورت سے زاہد

کا بھائی لگتا تھا۔ وہ اُس کا بھائی ہی تھا۔ دوسرے دو کے متعلق میں نے پوچھا تو بتایا گیا کہ ان کے قریبی رشتہ دار ہیں جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ دونوں ہم عمر لگتے تھے۔ چوبیس پچیس سال عمر ہو گی۔

مجھے یاد آیا کہ منوری کے باپ ملک نور احمد نے مجھے بتایا تھا کہ زاہد کے خاندان کی رشتہ داری دیہات میں ایسے لوگوں کے ساتھ تھی جن کے ہاں دشمنی کی بنا پر قتل اور لڑائی مار کٹائی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے میں اس خاندان سے واقف تھا۔

میں نے دونوں کے نام پوچھے۔ وہ آپس میں چچا زاد بھائی تھے۔ دونوں کے باپوں کے نام پوچھے۔ ان میں سے ایک کے باپ کو پانچ سال سزائے قید زیرِ دفعہ ۳۰۷ ہوئی تھی۔ وہ مجھے یاد آگیا۔ اُس کے بیٹے سے پوچھا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے جیل جاتا ہے یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ اور گھر والے جاتے رہتے ہیں۔

"تم دونوں کب جیل جا رہے ہو" — میں نے دونوں سے مذاق کیا — "دونوں ماشاءاللہ جوان ہو گئے ہو۔"

"یہ تو ہمارے دشمنوں پر منحصر ہے جی!" — ایک نے کہا — "وہ کبھی کبھی سر اُٹھاتے ہیں۔"

"اب جیل جانے کی ہماری ہی باری ہے جی!" — دوسرے نے ہنستے ہوتے کہا۔

میں نے زاہد سے پوچھا کہ ان کے ساتھ اُس کا کیا رشتہ ہے۔ اُس نے کوئی رشتہ بتایا جو قریبی تو نہیں تھا لیکن بہت دُور کا بھی نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ رشتہ کیا تھا۔

"رشتے سے تو ہماری دوستی زیادہ ہے" — دونوں میں سے ایک نے کہا۔

میں زاہد کو ایک کمرے میں لے گیا تو باہر دیکھا۔ وہ دونوں باہر جا

رہے تھے۔ میں نے آواز دے کر دونوں کو بلا لیا اور کہا کہ وہ یہیں بیٹھے رہیں۔ زاہد کو ایک کمرے میں لے جا کر پوچھا کہ زیور کون سے ٹرنک میں رکھا تھا۔ اُس نے ایک ٹرنک کھول کر دکھایا۔ دو ٹرنک اور ٹین کے دو سوٹ کیس بھی تھے۔

"بس یہی ٹرنک اور سوٹ کیس ہیں" — زاہد نے کہا — "میں نے آپ کو بالکل سچ بتایا ہے کہ وہ سارا زیور لے گئی ہے۔"

میں زیور کے متعلق اتنا زیادہ سنجیدہ نہیں تھا لیکن اُس نے دو تین بار کہا کہ یہی ٹرنک ہیں۔ آپ سارے ٹرنک اور سُوٹ کیس دیکھ لیں۔ کسی میں بھی زیور نہیں ملے گا۔

میں دوسرے کمرے میں گیا۔ اس میں دو پلنگ بچھے تھے۔ میں کوئی اور اشارہ یا سراغ دیکھ رہا تھا اور یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ایک پلنگ کے نیچے ایک سُوٹ کیس پڑا نظر آیا۔

"زاہد!" — میں نے اُسے کہا — "تم تو کہتے تھے کہ بس یہی ٹرنک اور سُوٹ کیس ہیں۔ ایک یہ پڑا ہے۔"

"اوہ!" — زاہد نے کہا — "اس کی مجھے یاد نہیں رہی تھی.... میں نے کہا تھا کہ اُس کمرے میں یہی ٹرنک اور سوٹ کیس ہیں۔"

اُس نے یہ بات ایسے انداز سے کہی کہ مجھے غصّہ آگیا۔ میں صاف سمجھ گیا کہ یہ شخص مجھے بیوقوف بنا رہا ہے اور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے غصّے کا اظہار کرتے ہوتے اُسے کہا کہ باہر نکالو اس سوٹ کیس کو اور کھولو۔

میں نے اُس کے انداز میں نمایاں طور پر جھجک دیکھی جیسے وہ اس سوٹ کیس کو کھولنا نہیں چاہتا۔ میں نے دھماکے جیسی آواز میں اُسے کہا کہ سوٹ کیس کھولے۔ وہ فوراً بیٹھ گیا اور سوٹ کیس پلنگ کے نیچے سے گھسیٹا۔

"اوہ!" — اُس نے میری طرف اُوپر دیکھ کر کہا — "اس کی چابیاں میری بیوی کے پاس تھیں۔ معلوم نہیں کہاں رکھ گئی ہے۔"

میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ لوہار کو

ساتھ لے آتے۔

"اس میں آپ کو کیا ملے گا ملک صاحب!"— زاہد نے کہا۔

"میں تمہیں یہ نہیں کہوں گا کہ چابیاں تلاش کرو"— میں نے کہا — "میں جانتا ہوں چابیاں گھر میں موجود ہیں۔"

پھر ایسے ہُوا کہ چابیاں گھر سے نکل آئیں۔ کانسٹیبل لوہار کو ساتھ لانے کے لئے چلا گیا تھا۔ سُوٹ کیس کھُلا۔ اس میں زاہد کے کپڑے تھے۔ دو تین کتابیں تھیں اور کپڑوں کے نیچے ایک لمبوترے ڈبے میں زیورات پڑے تھے۔

"یہ کس کا زیور ہے؟"

"اوہ!"— اُس نے کہا —"زیور تو یہ پڑا ہے۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ساتھ لے گئی ہے۔"

میں نے اُسے کچھ نہ کہا۔ کوئی سنگین جُرم ہُوا تھا یا نہیں، یہ تو ابھی دیکھنا تھا، مجھے اسی بات پر غصّہ آ گیا تھا کہ یہ شخص مجھے بیوقوف سمجھ رہا ہے اور میرے ساتھ کیسے کھیل تماشے کر رہا ہے۔

اس مکان کا ایک کمرہ اور تھا۔ میں اس کمرے میں گیا۔ وہاں بھی ایک پلنگ بچھا ہُوا تھا اور دیوار کے ساتھ کھونٹی سے زنانہ کپڑوں کے دو جوڑے لٹک رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے گھر میں پہننے والی ایک چپل پڑی تھی جو ڈیزائن اور سائز سے زنانہ معلوم ہوتی تھی۔ پلنگ کے تکیے کی طرف دیوار کے ساتھ سینڈلوں کے چار جوڑے اور ایک زری جوتی سلیقے سے رکھی ہوتی تھی۔

"اِدھر آ!"— میں نے زاہد کو بلا کر پوچھا —"کیا یہ تمہاری بیوی کا کمرہ ہے؟"

"جی!"— اُس نے جواب دیا —"وہ اسی کمرے میں سوتی تھی۔"

"اور تم؟"

"میں اپنے کمرے میں!"— اُس نے کہا —"چھ سات مہینوں سے ہم الگ کمروں میں سوتے تھے۔"

"ان جوتیوں کو دیکھو"— میں نے کہا —"اس کے علاوہ تمہاری بیوی کی کوئی اور جُوتی ہے؟"

وہ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ میں نے اُس کے سامنے ایک آدمی سے کہا کہ وہ زاہد کی ساس کو یہاں لے آئے۔

"ہاں ہاں!"— میں نے زاہد سے کہا —"بولو۔"

"اُس کی یہی جوتیاں تھیں"— اُس نے کہا۔

"اور وہ چپل وہ گھر پہنتی ہو گی۔"

"ہاں جی!"— اُس نے جواب دیا اور دو چار سیکنڈ بعد ہڑبڑا کر بولا —"ہاں ہاں، ایک جوڑا اور ہو گا جو وہ پہن کر گئی ہے۔"

منّوری کی ماں نے آتے زیادہ دیر نہ لگائی۔ میں نے اُسے بھی منّوری کی جُوتیاں دکھا کر پوچھا کہ اس کے علاوہ اس کی اور کوئی جُوتی تھی؟ ماں نے جُوتیاں دیکھیں اور وثوق سے جواب دیا کہ ان کے علاوہ اس کی اور کوئی جُوتی نہیں تھی۔

کرامت کے گھر بھی میں نے جوتیوں کو دیکھ کر شک کیا تھا کہ وہ گیا لے گیا ہے لیکن اُس نے یہ معلوم نہیں کرایا کہ کرامت گھر سے غائب ہے یا نہیں۔

اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ رپورٹ واپس لے رہا ہے اور اگر اُس کے سُسر نے اُس کے خلاف پولیس کو مقدمہ دیا تو وہ منّوری کا زیور پورا کر دے گا۔ یہاں سے مجھے خیال آیا کہ اُس کی بیوی اگر بھاگ ہی گئی ہے تو وہ زیور یا سارا زیور لے کر نہیں گئی اور زاہد اس پر چوری کا الزام لگانے کے لئے کہہ رہا ہے کہ وہ سارا زیور ساتھ لے گئی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہُوا تو ایک پارٹی نے تھانے میں یوں رپورٹ لکھوائی کہ دوسری پارٹی نے گھر میں داخل ہو کر حملہ کیا ہے اور عورتوں کے کانوں سے جھکے بالیاں اُتار کر لے گئے ہیں۔ یہ الزام ثابت کرنے کے

لئے عورتیں اپنے کان زخمی کر لیتی ہیں۔

ایسے ویسے تعلقات تھے

ایک تو زیور کے متعلق مجھے شک ہُوا اور کچھ شکوک اور تھے۔ میں کرامت کے گھر گیا تھا۔ اب میں نے زاہد کے گھر جانے کی بھی ضرورت محسوس کی۔ زاہد سے کہا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے چلے۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ وہ گھبرا رہا تھا اور کچھ دیر بعد اُس کی گھبراہٹ اتنی بڑھ گئی کہ وہ بات کرتا تھا تو زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔ مجھے تو ابھی معلوم نہیں تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ اور سہیلی کو علم نہ ہو۔

کس کا خاوند کس کی بیوی

"ایک بات بتاؤ" — میں نے اس لڑکی سے پوچھا — "منوری کے کرامت کے ساتھ کوئی ایسے ویسے تعلقات ہیں کیا؟"

لڑکی نے کچھ شرم و حجاب سے سر جھکا لیا۔ پھر آہستہ سے سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ تعلقات ہیں۔

"اپنے خاوند کے متعلق وہ تمہارے ساتھ باتیں کرتی ہو گی" — میں نے پوچھا — "کیا باتیں کرتی تھی؟"

اس لڑکی کا جواب بڑا لمبا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ زاہد کو منوری نے شروع شروع میں قبول کر لیا تھا لیکن زاہد ایسا واہی بیہودہ اور کم ظرف تھا کہ منوری پر جھوٹے الزام عائد کرتا رہتا تھا جن میں ناقابلِ برداشت الزام بدچلنی کا تھا۔ شادی سے پہلے کرامت اور منوری کی محبت تھی۔ شادی کے بعد منوری کرامت سے ہٹ گئی تھی۔ اب کوئی ایک سال پہلے منوری

نے خاوند کے سلوک سے تنگ آ کر کرامت کے ساتھ پھر محبت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

اس لڑکی نے بتایا کہ پانچ چھ مہینوں سے اُس کی اور زاہد کی بول چال اتنی ہی رہ گئی تھی کہ مطلب کی کوئی ادھوری سی بات کر لیتے تھے اور دونوں الگ الگ کمرے میں سوتے تھے۔

"کیا منوری نے تمہیں کبھی مذاق میں یا اشاروں میں بتایا تھا کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے گی؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — لڑکی نے جواب دیا — "ایسے تو اُس نے کئی بار کہا تھا۔ وہ بہت ہی تنگ آئی ہوئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ امی اور ابا طلاق نہیں لینے دیتے۔ پھر یہ بھی کہتی تھی کہ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں اور کبھی تو دل اتنا کڑھتا ہے کہ کچھ کھا کر مر جانے کی خواہش اُٹھتی ہے۔"

اس لڑکی سے میں نے بہت زیادہ پوچھ گچھ کی تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ رات کے بارہ بج چکے تھے اور میں زاہد کے گھر میں بیٹھا تفتیش میں مصروف تھا۔ میں نے اس لڑکی سے جہاں اتنے زیادہ سوال پوچھے وہاں ایک سوال یہ بھی تھا۔

"جس رات منوری غائب ہوئی وہ رات یاد کرو" — میں نے کہا — "کیا اُس دن منوری تمہیں ملی تھی یا تم اُس کے گھر آئی تھیں؟"

"وہ آئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "تھوڑی دیر بیٹھی اور چل پڑی۔ میں نے اُسے کچھ دیر اور بیٹھنے کو کہا تو اُس نے بڑا بُرا سا مُنہ بنا کر کہا کہ گاؤں سے اُس کے خاوند کے دو رشتہ دار ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ اُن کے لئے کچھ کرنا ہے۔"

"اُس نے بُرا سا مُنہ بنا کر مہمانوں کا ذکر کیوں کیا تھا؟"

"جیسے اپنا خاوند اچھا نہ لگے اُسے اُس کے رشتہ دار بھی بُرے لگتے ہیں" ... لڑکی نے کہا۔

یہ انکشاف میرے لئے اہم تھا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ مہمان کون تھے۔

اس لڑکی کو فارغ کر کے میں اس گھر سے باہر نکل آیا۔ محلّے کے ایک خاص آدمی کو الگ کر کے کہا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اُس روز زاہد کے ہاں گاؤں سے کون سے رشتہ دار آتے تھے۔ پھر میں نے زاہد سے پوچھا کہ جس رات اُس کی بیوی لاپتہ ہوتی ہے۔ اُس کے ہاں مہمان کون آیا تھا۔

اُس نے فوراً جواب نہ دیا۔ کچھ دیر سوچ کر اور ذرا ہکلا کر جواب دیا۔

"مہمان تو کوئی نہیں آیا تھا" — اُس نے کہا — "گاؤں سے دو آدمی آتے تھے اور وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے۔"

میں نے اس سے زیادہ اُس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ میں پھر اندر چلا گیا۔ زاہد کا چھوٹا بھائی الگ کھڑا تھا۔ میں نے اُسے الگ کر کے یہی سوال پوچھا۔

"یہی دو آدمی آتے تھے جو اب بھی اسی گھر میں موجود ہیں" —— اُس نے جواب دیا۔

"ظاہر ہے تم نے انہیں رات دو رات یہیں رکھا ہوگا" — میں نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ ان کی تمہارے ساتھ بہت محبت ہے۔ یہ دونوں بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی!" — اُس نے کہا — "وہ ایک ہی رات ٹھہرے تھے۔"

میں نے اس سے اور کچھ بھی نہ پوچھا اور میں اپنے تھانے کو چل پڑا۔

میں اپنے ساتھ زاہد، اُس کے چھوٹے بھائی اور گاؤں سے آتے ہوتے ان دونوں آدمیوں کو بھی لیتا گیا۔ تھانے لے جا کر انہیں الگ بٹھا دیا اور یہ حکم جاری کر دیا کہ انہیں ایک دوسرے سے دُور دُور بٹھا کر ان کی نگرانی کی جائے۔ میں خود گھر چلا گیا۔

صبح جب تھانے میں آیا تو اس محلّے کا وہ خاص آدمی جسے میں نے مہمانوں کے متعلق معلوم کرنے کو کہا تھا، تھانے میں آیا بیٹھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہی دو آدمی جو اب بھی یہاں موجود ہیں اُس شام زاہد کے ہاں آتے

تھے اور دو آدمیوں نے بتایا تھا کہ وہ مُنہ اندھیرے اس گھر سے نکلتے دیکھے گئے تھے۔ وہ آدمی جنہوں نے انہیں دیکھا تھا وہ مسجد میں نماز کے لئے جا رہے تھے۔

میں نے زاہد کو اپنے دفتر میں بلایا اور بٹھایا۔

"زاہد میاں!" — میں نے کہا — "تم اتنے جھوٹ بول چکے ہو کہ میں اب تم سے ہر ایک جھوٹ کی الگ الگ وضاحت نہیں مانگوں گا اور اب میں تمہیں یہ موقع بھی نہیں دوں گا کہ تم بتاؤ کہ یہ جھوٹ تم نے کس وجہ سے بولے تھے۔ اب میرے صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ اگر نہیں دو گے تو میں پولیس کے صحیح طریقے سے جواب تمہارے سینے سے نکال لوں گا .... تمہاری بیوی اور کرامت کہاں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم ہے صاحب!"

"میں نے پوچھا ہے تمہاری بیوی اور کرامت کہاں ہیں" — میں نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب!"

"میں پوچھ رہا ہوں" — میں نے میز پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر پوچھا — "تمہاری بیوی اور کرامت کہاں ہیں؟"

اُس کے ہونٹ کانپنے لگے لیکن آواز نہ نکلی۔

میں نے گرج کر کہا — "فوراً بولو" — اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن جہاں یہ یقین ہو جاتا کہ یہ مشتبہ یا ملزم واقعی ملزم ہے اور چکر دینے کی کوشش میں ہے تو اُس کی خاطر تواضع کرنی پڑتی تھی۔ اس ملزم کے متعلق جس کا نام زاہد تھا، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا ہے لیکن اس نے قدم قدم پر جھوٹ بولا تھا اور مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی ثبوت کافی تھا کہ اس نے کوئی سنگین واردات کی ہے یا یہ اصل ملزموں کو اور اصل وقوعہ کو جانتا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ مزید جھک جھک نہ کی۔ ایک

ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور زاہد کو اُس کے حوالے کر کے کہا کہ یہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کی ہمت نہیں پڑ رہی۔

ہیڈ کانسٹیبل اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہُوا لے گیا۔ میں نے زاہد کے دیہاتی رشتہ داروں میں سے ایک کو بلایا۔

"کب سے یہاں آئے ہُوئے ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

"ہم کل صبح آئے تھے" —— اُس نے جواب دیا۔

"پچھلی بار کب آئے تھے؟"

"پچھلی بار؟" —— اُس نے سوچ کر جواب دیا —— "کوئی ایک مہینہ ہو گیا ہو گا۔"

میں نے اُسے باہر بھیج دیا اور دوسرے کو بلایا۔ اُس سے بھی یہی سوال پوچھے۔ اُس نے جواب دیا —— "ڈیڑھ دو مہینے پہلے۔"

میں نے ابھی زاہد کے چھوٹے بھائی کو نہ بلایا۔ میں دوسرے کسی کام میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزرا ہو گا کہ ہیڈ کانسٹیبل ہنستا مُسکراتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ زاہد مجھے بُلا رہا ہے۔ میں گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے جس پوزیشن میں رکھا ہُوا تھا وہ کم از کم زاہد کے لئے پندرہ منٹ سے زیادہ قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں گوشت کی بوٹیوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ وہ اشارے کر رہا تھا کہ اُسے ذرا مہلت دی جائے۔ میں نے اُسے بٹھا دیا۔ پانی پلایا اور اُسے ہوش و حواس نارمل حالت میں لانے کا وقت دیا۔ میں نے اس دوران اُسے کہا کہ یہ پہلی سیڑھی ہے اور ابھی اُسے صرف ذائقہ چکھایا گیا ہے۔

اُس کے لئے اتنا ہی کافی ثابت ہُوا۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"میں مجبور ہو کر بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں" —— اُس نے روتے ہوئے کہا —— "ملک صاحب! آپ کی بہت شہرت سُنی ہے۔ مجھے بچا لیں۔ ساری عمر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

"کچھ کہو تو سہی!" —— میں نے کہا —— "پہلے اپنا جرم سناؤ تاکہ میں سوچوں

کہ تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں۔ تم میرے دشمن تو نہیں ہو۔ میرا تو تم نے کچھ نہیں بگاڑا۔"

اُس کی زبان پر بات آتی اور واپس چلی جاتی تھی۔ جُرم کا اقبال کرنے سے پہلے مجرم کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے اُس کی راہنمائی کی۔

"مجھے یہی بتا دو کہ تمہاری بیوی اور کرامت کہاں ہیں؟" —— میں نے کہا۔

"وہ زندہ نہیں ہیں" —— اُس نے کہا۔

"ہاں!" —— میں نے کہا —— "ایسے بولو نا .... اچھا ہُوا دو بدکار اس دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ میں اسی پر کیس فائل کر دوں گا کہ منوری اور کرامت اکٹھے بھاگ گئے ہیں اور کوئی سراغ نہیں ملا۔"

اُس کے حوصلے میں جان آ گئی اور اُس نے اپنے جرم کی ہر ایک تفصیل سُنا دی۔ وہ منوری کی کرتُوت سے تنگ آ گیا تھا۔ اُس کے باپ سے ڈرتا اُسے طلاق نہیں دیتا تھا۔ منوری کے والدین منوری کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ زاہد نے تنگ آ کر اپنے ان گاؤں والے دونوں رشتہ داروں کے ساتھ بات کی۔ رشتہ داری کے علاوہ ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ انہوں نے زاہد سے کہا کہ یہ تو ساری برادری کی بے عزتی ہے۔

ان دونوں نے زاہد کے ساتھ مل کر منوری اور کرامت کو ٹھکانے لگانے کی سکیم تیار کر لی۔ زاہد کو معلوم تھا کہ کرامت تقریباً روزانہ رات اپنے ایک دوست کی بیٹھک میں تاش کھیلنے جاتا ہے۔ انہوں نے دن کے وقت قصبے کے مضافات میں ٹیلوں کے ایک علاقے میں ایک جگہ دیکھ لی جہاں لاشیں چھپائی جا سکتی تھیں۔

واردات کی رات زاہد نے منوری کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اُس کی لاش کو زاہد، اُس کے چھوٹے بھائی اور ان کے دونوں دیہاتی رشتہ داروں نے دوہرا کر کے بوری میں ڈالا اور بوری کا مُنہ سُوتلی سے سی دیا۔

زاہد کے چھوٹے بھائی نے دیکھا کہ کرامت اپنے دوست کی بیٹھک میں تاش کھیل رہا ہے۔ چاروں نے گھات لگائی۔ وہ ایک گلی کی نکڑ پر کرامت کا راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کرامت کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ تاش کھیل کر آیا تو زاہد، اُس کے بھائی اور دونوں رشتہ داروں نے اُسے پکڑ لیا۔ ساڑھے بارہ بجے کے کچھ بعد کا وقت تھا۔ اُسے کہا کہ وہ اُن کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلے۔ گاؤں کے دونوں آدمیوں نے اُسے چاقو دکھاتے اور اُسے کھیتوں میں لے گئے۔ وہ چاقوؤں کے ڈر سے خاموشی سے اُن کے ساتھ چلا گیا۔

کھیتوں میں جا کر گاؤں کے ایک آدمی نے پیچھے ہو کر کرامت کا گلا ہاتھوں میں لے کر دبایا اور اُسے جان سے مار کر چھوڑا۔ گاؤں کے دوسرے آدمی نے اُسے اپنے کندھے پر پیٹ کے بل اس طرح ڈالا کہ اُس کا سر اور بازو قاتل کی پیٹھ کے پیچھے لٹک رہے تھے اور پاؤں آگے تھے۔

وہ باری باری اُس کو اُٹھا کر اُس جگہ لے گئے جہاں ایک چھوٹا ٹیلہ ایک طرف سے دیوار کی طرح سیدھا تھا۔ اس میں ایک قدرتی شگاف تھا جو زمین سے کچھ اُوپر تھا۔ اندر سے یہ فراخ تھا۔ وہ ایک کدال ساتھ لے گئے تھے۔ اُنہوں نے لاش وہاں پھینکی اور اس پر مٹی ڈالنے لگے۔

گاؤں والے آدمیوں نے زاہد اور اُس کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لیا اور زاہد کے گھر سے وہ بوری اُٹھا لائے جس میں منوری کی لاش بند تھی۔ اسے بھی وہیں لے گئے۔ اُنہوں نے کدال سے شگاف کے اندر کھدائی کی تھی جس سے وہ جگہ گہری ہو گئی تھی۔ منوری کی لاش والی بوری اس میں پھینک کر اوپر مٹی اس طرح ڈالی کہ اُوپر سے اور دائیں بائیں سے شگاف کو کھودا اور یہ قبر بھرتی چلی گئی اور شگاف کے اندر مٹی کا ڈھیر لگ گیا۔

اتنا بھیانک جُرم اتنا آسان نہیں تھا جتنی آسانی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے غیر معمولی دلیری اور غیر معمولی مضبوط دل کی ضرورت تھی۔ یہ دلیری زاہد کے ان دیہاتی رشتہ داروں میں بہت تھی۔

کرامت کو جب اُٹھا کر لے جا رہے تھے اُس وقت اُس کی جیب سے لفافہ گرا تھا پھر ایک سلیپر اور آگے جا کر دوسرا سلیپر پاؤں سے نکل کر گر پڑا تھا۔ جس کا ان چاروں کو علم نہ ہو سکا۔ منوری کی تمام جوتیاں گھر میں رکھی تھیں کیونکہ اُسے سوتے میں قتل کیا گیا تھا اور بوری میں بند کر دیا گیا تھا۔

ان لوگوں نے قتل کے بعد کی سکیم اس طرح بنائی تھی کہ زاہد صبح تھانے جا کر رپورٹ دے گا کہ اُس کی بیوی کرامت کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔

میں نے ملزموں کی نشاندہی پر لاشیں برآمد کیں اور بڑی محنت سے کیس تیار کیا۔ زاہد اور اُس کے دونوں دیہاتی رشتہ داروں کو سزائے موت اور زاہد کے چھوٹے بھائی کو اعانتِ جُرم میں پانچ سال سزائے قید ہوئی۔ اپیل کی گئی تھی لیکن مسترد ہو گئی۔